سائرہ رضا

محبت داغ کی صورت



سائرہ رضا

محبت داغ کی صورت

"آپ ہر بار یہی کہتی ہیں۔" وہ کچھ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ آر یا بار کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔

"نہیں بیٹے۔!" وہ لہجے میں مزید شہد سمو کر گویا ہوئی۔ "ہر بار کیوں؟ کتنی امپورٹنٹ ہے آپ کے لیے پڑھائی' ففتھ اسٹینڈرڈ کا ایگزام۔ اس کے رزلٹ پر آگے آپ کو۔"

"مام!" اس نے بات کاٹ دی۔ "ایگزام تو امپورٹنٹ ہی ہوتا ہے مگر یہ چھٹیاں ہیں اور سب گھر جا کر انجوائے کر رہے ہیں۔"

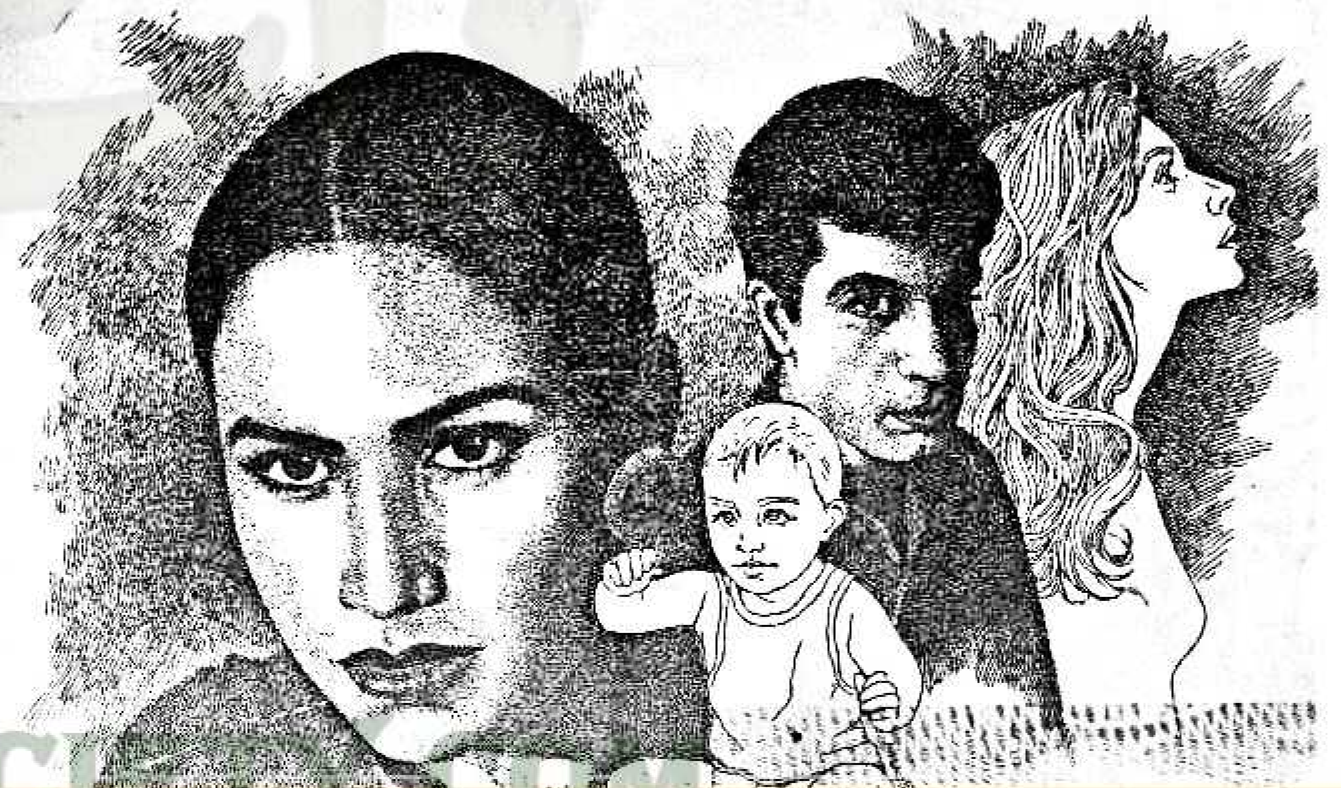
"گھر میں کیا انجوائے منٹ۔۔۔ میں اپنے آفس میں بزی ہوتی ہوں۔ آپ کے بابا ویسے بھی کسی آفیشل ٹور پر ہوں گے۔ چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ آپ کیا کرو گے۔ وہ تو بہت ہی چھوٹے ہیں نا۔" اس کی ساری سلجھے لہجے کی گفتگو در حقیقت بکواس تھی۔ وہ خود بھی سمجھ رہی تھی اور سامنے بچے کو بھی اس "بکواس" سے کوئی سروکار نہیں۔

"ہاں تو میں ان ہی کے ساتھ کھیلوں گا نا۔" اس نے اپنے دل کی بات کہی۔

"نہیں گود میں اٹھاؤں گا' گھوڑا بنوں گا' دونوں کو باریاں دوں گا اور ہم کھلونوں سے کھیلیں گے نا۔"

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ ایسے تو وہ گر جائیں گے۔ چوٹ لگے گی تو رونا پڑیں گے۔" اس نے چہرے پر

مکمل ناول



مصنوعی ہراس پیدا کیا۔

"میں گرنے بھی نہیں دوں گا اور چوٹ تو کبھی بھی نہیں لگے گی اور روئیں گے تو چپ کرواؤں گا۔ میں بڑا بھائی جان ہوں مام۔۔۔!"

"وہ تو آپ ہو ہی۔۔۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کے بال سنوارے۔

"میں تو دراصل یہ چاہ رہی تھی کہ آپ اسکول گروپ کے ساتھ سیر کو جاتے 'یہی تو انجوائے کرنے کے دن ہیں۔"

"مجھے بس گھر آنا ہے اور صرف گھر کے اندر رہنا ہے۔ کہیں بھی نہیں جانا۔ یہاں تک کہ میں لنچ یا ڈنر کے لیے بھی باہر نہیں جانا چاہتا۔ ایوری تھنگ ایٹ ہوم۔" وہ قطعیت سے کہہ رہا تھا اور اسے اس لہجے کی پہچان تھی۔

"آپ بس مجھے گاڑی بھیج دیں۔ ورنہ میں اسد کے ساتھ آجاؤں گا۔"

"اوہ۔۔۔ نہیں۔" وہ گھبرائی۔ "اکیلے مت نکلنا میں بھیج دوں گی۔" اس نے ہارے لہجے میں کہا تھا۔

وہ اس کے لہجے کا ضدی پن' قطعیت دیکھ آئی تھی۔ وہ اسے خوامخواہ کی باتوں سے بہلا رہی تھی جبکہ بخوبی جانتی تھی۔ اتنے دن کی چھٹیوں میں وہ اکیلا ہاسٹل میں کیا کرے گا۔ وہ ہاسٹل یا پڑھائی سے بھاگنے والا بچہ نہیں تھا۔ بہت کلیئر تھا اپنی پڑھائی کے حوالے سے۔ اس نے کبھی ضد نہیں کی کہ اسے ہاسٹل میں رہ کر نہیں پڑھنا۔ خاندان کے کئی بچے پڑھتے تھے اور جہاں اس کی مام کی پوسٹنگ تھی وہاں اچھا اسکول نہیں تھا۔ اٹس اوکے۔۔۔ بٹ وہ چھٹیوں میں ادھر ادھر کیوں گھومتا ہے۔ اسے گھر میں رہنا ہے پہلے جب بہت چھوٹا تھا تب سب سمجھ جاتا تھا' لیکن اب وہ بڑا ہو رہا تھا وہ سوال و جواب کرکے لاجواب کرنے میں ماہر ہو گیا تھا۔

کم از کم اس کو تو ایسا ہی لگتا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی' مگر اس کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارنا بہت مشکل لگتا۔ بچوں کے لایعنی سوالوں کے جواب تحمل اور کاملیت کے ہمراہ دینا اور بچوں کو سننا ویسے ہی صبر آزما کام ہے۔ دل گردے اور ظرف کا اور پھر اگر بچہ ذہین ہو اس کے سوالوں' اور حیرتوں اور اعتراضات کا جواب تو وہ گوگل سرچنگ کے ذریعے بھی نہ دے پاتی۔

اب بھی دانتوں تلے ہونٹ دبائے اسے دیکھ رہی تھی جو لاؤنج کے بیچ و بیچ کھڑا سراپا سوال تھا' حیران تھا' بے یقین تھا اور سب سے بڑھ کر دکھی تھا۔

"آپ نے میرے بغیر شہیر کا برتھ ڈے سیلبریٹ کرلیا۔"

"کوئی خاص سیلبریشن نہیں۔ بس آپ کے بابا اچانک کیک۔۔۔"

"دس از ناٹ اچانک کیک مام۔۔۔!" وہ چلایا تھا۔

"اچانک ایسے نہیں ہوتا۔" وہ رو دینے کو تھا۔ مام اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

وہ چار فٹ قد کا بچہ تھا۔ بڑے نیکر اور ریڈ شرٹ میں ملبوس' مگر چہرے پر غم صدیوں کو بھگتائے بابے جیسا تھا اسے صدمے نے شل کر دیا تھا۔ وہ جواب چاہتا تھا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ ماں اسے مطمئن نہ کر سکے گی۔

"بیٹا! آپ کی پڑھائی۔۔۔"

"کیا پڑھائی! آپ مجھے انفارم کر دیتیں' میں آجاتا۔ میری میم مجھے فوراً" چھٹی دیتیں کہ میں ان کا فیورٹ اسٹوڈنٹ ہوں' میں نے کبھی چھٹی نہیں کی سب کام وقت پر کرتا ہوں۔ وہ مجھے ایپری شیٹ کرتی ہیں۔ میں ان سے ایک بار کہہ دیتا' وہ مجھے خود بھیج دیتیں اور آپ کہتی ہیں کہ۔۔۔"

وہ چپ کر گیا۔ مثالیں کم نہیں ہوئی تھیں' وہ یک دم نڈھال ہو گیا تھا۔

مام کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ وہ اپنے بارے میں ایک لفظ غلط نہ کہہ رہا تھا۔ یہ خوبیاں اور عادتیں تو اس کی جینز کا حصہ تھیں۔

"اس سے پہلے۔۔۔" اسے کچھ اور یاد آیا۔ "پھپھو کے بیٹے احسن بھائی کی شادی کا میں انتظار کرتا رہا کہ ہم سب اکٹھے ہوں گے' سب فیملی کزنز۔۔۔ آپ سے بھی پوچھتا رہا ڈیڈ سے بھی۔۔۔ آپ دونوں نے کہا۔ ابھی طے نہیں ہوا۔ کچھ دن باقی ہیں' کبھی یہ بولا' کبھی وہ بولا اور میں نے گھر فون کیا تو پتا لگا۔ آپ سب لوگ شادی میں گئے ہیں۔ مجھے بتایا تک نہیں۔" اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔

"بیٹا! شادی تو بیچ یک دم ہوئی۔ احسن کی ہونے والی مسز کے دادا جی بیمار تھے تو انہوں نے زور دیا تو بس جیسے منٹوں میں۔۔۔ فیصلہ ہو گیا۔"

"تو مجھے کیوں نہیں بلوایا؟" اس کا ریکارڈ وہیں اٹکا ہوا تھا۔

"بیٹا شادی تھی۔ سب ہڑبونگ میں ہوا۔ آپ کا نہ ہونا اتنا۔۔۔"

"لیکن برتھ ڈے میری بغیر کیسے کرلی گئی اب آپ کہہ دیں کہ اس میں بھی میرا کیا کام' شادیوں میں بچوں کا کیا کام۔۔۔؟"

"ہاں نا۔" مام "تائیداً" سر ہلانے لگی۔ تشفی کا نیا جملہ مگر۔۔۔

"شادی تو بڑوں کا ایونٹ ہے۔ بچے تو۔۔۔"

"کیوں؟" اس نے لڑاکوں اور جاہلوں کی طرح ہاتھ نچایا۔ "میں نے تو آج تک کوئی ویڈنگ کارڈ نہیں دیکھا جس پر لکھا ہو بچے ناٹ الاوڈ۔ وہ اردو میں لکھتے ہیں بمعہ اہل و عیال۔۔۔ شادی کلب پارٹی نہیں ہوتی کہ اونلی مسٹر اینڈ مسز جاتے ہوں۔" وہ اسے ہر بار لاجواب کر دیتا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ہر بار حیران ہوتی تھی۔

"اچھا ابھی آ رہی ہیں نا آپ کے تایا کے گھر شادیاں۔۔۔ تو اس میں تو آپ ہوں گے ہی' پیپرز کے بعد اپریل میں رکھی جائیں گی' سدرہ کا برتھ ڈے بھی نزدیک ہے۔"

"آپ اس میں بھی کوئی بہانہ کر دیں گی کہ نئی کلاسز شروع ہیں' شادی میں کیا رکھا ہے۔"

"میں ایسا نہیں کروں گی زین۔۔۔!" وہ چاہنے کے باوجود اسے ڈانٹ نہیں پاتی تھی نہ اونچا بول پاتی۔ وہ جتنا بھی بھڑکتا۔ وہ اتنی دھیمی ہوتی جاتی۔ اس کا کیا قصور تھا۔ سارے قصور خود اس کے ہی نکلتے تھے۔ سارے جرم' ساری دفعات' سارے خسارے۔۔۔ اس کے تھے۔ ان کے تھے' ان دونوں کے۔۔۔

"اور کبھی آپ نے میرا برتھ ڈے تو ایسے سیلبریٹ نہیں کیا' فیملی اوکیژن کہہ دیتی ہیں' کبھی میرے دوستوں کو نہیں بلاتیں' بس کیک کاٹ دیتی ہیں گفٹس دے دیتی ہیں آپ!"

"اچھا! اس بار آپ کی برتھ ڈے بھی ایسے ہی کریں گے۔"

"آپ جھوٹ بولتی ہیں۔ اور سوری۔۔۔ آپ غلط وعدہ کرتی ہیں یا بھول جاتی ہیں یا کبھی بزی ہو جاتی ہیں۔" اسے ماں کے رتبے کا احساس تھا' اس نے کسی کے ٹوکے بغیر تصحیح بھی خود سے کرلی تھی۔

"شادی میرے بغیر ہو سکتی ہے بچوں کا کیا کام؟ شہیر' سدرہ' مونا' علی' خدیفہ' عینی' یارو۔۔۔ کوئی نہیں گیا ہو گا نا؟" اس نے اپنے ہم عمر کزنز کا نام لینا شروع کر دیا۔ "حسن اور شاہین بھی۔۔۔"

"اور برتھ ڈے بھی میرے بغیر۔۔۔" وہ صوفے پر اسی کے برابر گر سا گیا۔

"میں اتفاق سے البم نہ دیکھ لیتا' نیٹ پر پوری ویڈیو تھی۔ مجھے تو پتا بھی نہ لگتا آپ پھر جھوٹ بول۔۔۔ بتاتیں ہی نہ بلکہ۔۔۔" وہ رونے لگا۔

"آپ لوگ مجھے اپنے ساتھ رہنے ہی نہیں دیتے۔" وہ ہتھیلی سے آنسو رگڑنے لگا۔

مام کا دل موم ہو گیا۔ قطرہ قطرہ۔۔۔ اس نے آگے ہو کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ اپنے ہونٹ اس کے بالوں سے جوڑ دیے۔ وہ بالوں سے اٹھتی مہک کو اندر روح تک کھینچ رہی تھی' سکون مل رہا تھا مگر وقتی۔

جو بے سکونی دل میں تھی۔ زندگی میں تھی اس کا کیا علاج۔۔۔

⭐ ⭐ ⭐

بھرپائی کرنے کے خیال سے اگلے کئی دن ماما نے اس کے ساتھ گزارے۔ وہ اسے لے کر پارک گئی۔ تینوں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کارٹونز فلم دیکھیں ایک جانب زین کو بٹھایا۔ ایک طرف سدرہ۔ گود میں شہیر۔ اسے شاپنگ کروائی یہاں تک کہ اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ کھانے بھی بنائے۔

چپس کیچپ اور سینڈوچز۔۔۔ بالوں کو بہت اوپر سمیٹے ایپرن لگا کر آستین موڑے وہ ایک ماڈرن شیف لگ رہی تھی۔

"تو ناظرین آج کے پروگرام میں ڈی او صاحبہ ہماری مہمان ہیں اور ہمیں بتائیں گی کہ اپنے بچوں کے لیے کھانا کیسے بناتے ہیں۔" زین نے بیلن کو ایز اے مائک اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔

"محبت سے۔۔۔" مائک اس کے سامنے آیا تو اس دو حرفوں میں بات سمیٹ دی۔

"نہیں ہمارے ناظرین اجزاء کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ آپ نے کیا کیا استعمال کیا۔ کتنی مقدار میں۔"

"بہت سی محبت۔۔۔ ڈھیر سارا پیار۔ کس حسب ضرورت۔۔۔"

وہ بھی شرارت اور مزے کے موڈ میں تھی۔ اس نے اپنی کچن ہیلپرز کو باہر نکال دیا تھا' وہ خود بچوں کے لیے کچھ بنائے گی۔ حالانکہ اسے کچھ بھی خاص بنانا نہیں آتا تھا کچن اس کی فیلڈ ہی نہ تھا۔ شادی سے پہلے پڑھائی کے چکر۔۔۔ بعد میں ایک ملازمہ سرکاری مل گئی۔ ایک سرتاج صاحب نے رکھ دی' لیکن ابھی وہ کچھ نہ کچھ تو بنا لیتی۔

کام والی خیرن اس فرصت سے لطف اٹھانے کے لیے لان میں نکل آئی۔ وہ مالی سے اندر کا حال بیان کررہی تھی۔ ڈرائیور بھی نزدیک سرک آیا۔

"صاحب تو کل آئے گا۔" وہ بولا تھا۔ "کرکٹ کا سب سامان وہاں تیار رکھو۔ زین بابا کے ساتھ میچ ہوگا اور ادھر نہر میں مچھلی پکڑنے کا بھی بولا۔ سب تیاری کرکے رکھنی ہے بابا!" دونوں کے پاس اپنی اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے اطلاعات تھیں۔

"آں بابا میرے کو بھی بولا۔ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے لوں۔ زیادہ لوگ ہوں گے تو زین بابا کو اچھا لگے گا۔" ڈرائیور نے ذرا فخر سے کہا۔

"ہمارا صاحب ہے ہی بہت اچھا اور میڈم صاحب بھی ابھی اندر۔۔۔" خیرن تفصیل سے بتانے لگی۔

"او بابا آو۔۔۔ اللہ سائیں کا خاص لوگ ہوتا ہے ایسا ورنہ ایسا لے پالک بچے کو کون پیار کرتا ہے۔" مالی نے انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ وہ آنکھیں بند کرکے جھوم رہا تھا۔

خیرن اور ڈرائیور نے "تائیداً" زور و شور سے سر ہلائے تھے۔

⭐ ⭐ ⭐

محبت خواب کی صورت۔
نگاہوں میں بسی رہتی ہے کسی مہتاب کی صورت
محبت آگ کی صورت
بجھے سینوں میں جلتی ہے تو دل بیدار ہوتے ہیں
محبت کی۔۔۔

اس نے اس بار چھٹیاں خوب انجوائے کی تھیں۔ بہت خوش کن وقت گزارا' مگر واپس تو آنا ہی تھا مگر واپس آتے ہوئے وہ خوش نہیں تھا۔ دوبارہ کب جاپائے گا۔ سام اور ڈیڈ۔۔۔ اور گھر لان اور سارا شہر۔۔۔

حالانکہ اس کی بہت ساری خواہشات پوری نہیں ہوئی تھیں۔ پھپھو اور تایا کے گھر۔۔۔ مگر زم خو ماما نے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ اسے رویوں کی سمجھ بہت پہلے سے آنے لگی تھی' مگر رویوں کی وجوہات۔۔۔؟ وہ کھوج نہ لگا پاتا۔ اسے لگتا اسے اگنور کیا جاتا ہے۔ علیحدہ رکھا جاتا ہے یا پوشیدہ رکھا جاتا ہے' مگر کیوں؟

اس کا سارا سامان چوکیدار اندر لے جا چکا تھا۔ وہ مین گیٹ سے اندرونی عمارت کو جاتی سیاہ سڑک پر بہت تھکے قدموں چل رہا تھا۔ سر پر کیپ تھی ہاتھ میں

گیند تھی جسے تولتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے پیچھے اس کا بیٹ زمین پر رگڑ کھاتا گھسٹ رہا تھا۔ گیند ہاتھ سے لڑھکی' روڈ سے اتری لان میں دوڑی۔ گملے سے ٹکرائی اچھلی اور پھر گھومتی گھومتی کتنی ہی دور چلی گئی۔

وہ رک گیا اور گیند کی بے بسی کو دیکھنے لگا جو ساکت ہونے سے پہلے کتنی دیر تک لرزتی رہی تھی۔ اسے لگا وہ بھی گیند ہے مگر بس اس کی سوچ اتنی ہی تھی۔ وہ گیند لینے آگے بڑھ گیا۔ بیل بج رہی تھی۔ اسے اب اندر جانا تھا۔

مگر نو عمر ذہن میں آنے والا ایک جملہ کہ "وہ گیند جیسا ہے" واقعی حقیقت تھا۔ وہ واقعی گیند تھا۔۔۔ ۔۔۔ لڑھکتا۔ ٹھوکر کھاتا اور آج سے نہیں ہمیشہ سے۔ جب پانچ سال کا تھا تب سے۔

⭐ ⭐ ⭐

"میں منافقت میں نہیں جی سکتا۔ بس تم اسے واپس کردو۔"

"یہ بے جان مانگی ہوئی کیتلی نہیں ہے جو ضرورت پوری ہوگئی تو واپس لوٹا دیں۔ یہ جان دار انسان ہے بچہ ہے اور وہ بچہ جس نے ہماری زندگی میں اس وقت رنگ بھرے جب ہم جیتے جاگتے انسان تھے مگر کفن پوش دکھائی دیتے تھے۔"

"ہاں تو میں نے کب انکار کیا۔ بدل میں سب کچھ تو دیا محبت' توجہ' خوراک' سرد و گرم سے بچا کر رکھا' لیکن! تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ اب نہ تو ہمیں اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے ہماری۔۔۔"

"یہ کیسی بات ہے۔ وہ فقط پانچ برس کا بچہ ہے اسے کیسے ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو کولر کی ٹونٹی دبا کر پانی تک نہیں نکال سکتا اور آپ کہتے ہیں۔" وہ تڑپ اٹھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔" وہ جھنجلایا۔ کیسے سمجھائے اس عورت کو۔۔۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اب ہماری اپنی اولاد ہے۔ ہمارا اپنا بچہ۔۔۔ مجھے لگتا ہے' ہم انصاف نہیں کرپائیں گے۔"

"کیوں نہیں کرپائیں گے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ دونوں قریب ہی بیڈ پر سو رہے تھے پانچ سالہ زین اور دو ماہ کا سبطین۔۔۔ "لوگوں کے درجن درجن بچے ہوتے ہیں ... نئے بچے ہوتے رہتے ہیں تو پرانوں کو نکالتے جاتے ہیں۔" اس نے اپنے تئیں اسے لاجواب کردیا تھا۔

"نہیں نکالتے۔۔۔ کبھی نہیں نکالتے مگر وہ ان کے اپنے بچے ہوتے ہیں۔ یوں یہ بھی میرا اپنا بچہ ہے۔ میرا خون۔۔۔ میرا دل۔۔۔ میری۔۔۔" بچہ تو سو رہا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے سے لگا کر یوں بھینچے جیسے ان میں بچہ ہو' سینے سے لگا ہو۔

"بہرحال میں فیصلہ کرچکا ہوں۔۔۔ اور۔۔۔ اور باقی سب بھی یہی مناسب خیال کرتے ہیں۔"

"باقی سب کون؟" وہ بری طرح چونکی۔

"باقی سب' امی' ابا اور بھائی بہن۔" وہ نظریں چرا کر

بولا تھا۔ "اور دوسرے اصل بات یہ ہے کہ اب وہ پہلے جیسی مجبوری بھی نہیں ہے۔ نہ ہمیں اور نہ انہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ ناسمجھی سے شوہر کی صورت دیکھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ۔۔۔ وہ وقت گزر گیا۔ بھول بھال گئی دنیا کہ یہ بچہ۔۔۔ پہلے کی بات اور تھی مگر اب تو وہ ویل اسٹیبلشڈ ہے۔ ایک عہدے پر۔۔۔ رتبہ ہے۔ بات میں وزن ہے۔ اب وہ اسے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔" وہ جملوں سے زیادہ آنکھوں سے سمجھا رہا تھا۔

"لیکن کیا ان کی اس نئی زندگی میں اس کی جگہ ہوگی؟ کوئی نہیں جانتا کہ۔" وہ اٹک گئی۔

"سب سیٹ ہو جاتا ہے۔ جگہ خود بخود بن جاتی ہے' میں بہرحال فیصلہ کرچکا ہوں۔ ناانصافی میرے اپنے بچے کے ساتھ ہوگی' یہ ڈر نہیں ہے' مگر میں اس سے محبت نہیں کرسکوں گا اب۔ تم سمجھ کیوں نہیں رہی ہو۔"

وہ اب پینترا بدل کر داؤ کھیل رہا تھا۔ وہ سوچ میں ڈوبی تھی۔

☼ ☼ ☼

کالج میں گزارے جانے والے پانچ گھنٹے ذہنی اور جسمانی اعتبار سے پرمشقت تھے اور پھر اگر پڑھنے والی شجرۃ الدر ہو تو۔۔۔ جو کبھی بیسرٹس نہیں کرتی تھی۔ فارغ وقت میں بھی دوستوں کے جھنڈ میں بیٹھنے کے بجائے وہ لائبریری چلی جاتی۔ کتابیں پڑھتی' اخبار کی ورق گردانی کرتی' کینٹین جانے کا شوق بھی نہیں تھا اور پاکٹ منی اس کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ اخبار کا پورا صفحہ چہرے کے آگے پھیلا لیتی اور بند ہونٹوں کے ساتھ بے آواز گھر سے لائے پراٹھے کے لقمے اتارتی رہتی۔

لائبریرین نے اس بات کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ نظرانداز کردیتی تھیں۔ وہ سیکنڈ ایئر میں تھی اور ان پونے دو سالوں میں سب سے زیادہ کتابیں جاری کروانے کا اعزاز اسی کو حاصل تھا۔ اس کے ظاہری حلیے سے اس کی کلاس کا پتا چلتا تھا۔ ایک سفید پوش گھرانے کی سادہ سی لڑکی' سستا سا بیگ' ڈھیلا ڈھالا یونیفارم لمبی چوٹی' سادگی سے بنا مانگ نکالے گندھی ہوتی۔ وہ چوٹی آگے ڈال لیتی اور پڑھنے کی محویت کے دوران چند لٹوں سے کھیلتی رہتی۔

سارے اخبارات چاٹ جاتی۔

اتنی قابل اور علم دوست لڑکی کے لیے لائبریرین کے دل میں خود بخود گنجائش پیدا ہوگئی تھی۔

اور بے پناہ ذہنی مشقت کے بعد وہ جسمانی مشقت بھی جھیلتی تھی۔ اور شاید بخوشی بھی۔ یا شاید اب عادی ہوگئی تھی۔ کالج گھر سے کافی دور تھا اور اسے دو بسیں کرنا پڑتی تھیں مگر وہ صبح میں جلدی کے باعث دو بسیں کرلیتی مگر واپسی پر ایک ہی بس لیتی۔ محسنہ اسے پورا کرایہ بھی دیتی تھیں اور جیب خرچ کے نام پر بھی کچھ نوٹ تھما دیتیں۔ مگر شجرۃ کو وہ پیسے بچانے ہوتے تھے۔ اور اسی ۔۔۔ لیے وہ پراٹھا کھاتی اور پیدل چلتی۔ اور مہینے کے آخر میں کوئی کتاب خریدتی۔ نوٹس لیتی اور اپنی پڑھائی کے دیگر اخراجات نکالتی۔ وہ جانتی تھی محسنہ اسے اتنی ہی رقم دے سکتی ہیں۔ جس میں کٹوتی خارج ازامکان نہیں تھی اور بڑھوتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

☼ ☼ ☼

کلاس میں شجرۃ کی واہ واہ تھی۔ ٹیچر اس کے رزلٹ سے بہت خوش تھیں۔

شجرۃ کی لکھائی موتیوں جیسی تھی اور اغلاط سے پاک پیپر اس قابل تھا کہ اسے اخبار میں چھپوا دیا جاتا۔

"تمہارے پیرنٹس بہت خوش ہوئے ہوں گے ناں شجرۃ۔" ٹیچر کے جانے کے بعد کچھ لڑکیاں تو جلے منہ بناتی کلاس روم سے بھاگیں۔ مگر ایک ڈھیر سا اس کے گرد بھی اکٹھا ہوگیا تھا۔ سب اس کا پیپر دیکھنے کی کوشش میں ڈیسک پر گھیرا بنا کر جھکی ہوئی تھیں۔

"پیرنٹس نہیں۔" ایک لڑکی نے ٹوکا۔ "صرف مدر۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں ناں شجرۃ۔ تمہارے فادر؟" وہ قصدا" رکی کہ شجرۃ خود ہی درست جواب دے دے۔

"ہاں!" اس نے واضح صاف لہجہ میں اثبات میں سرہلایا۔

"وہ فوت ہوچکے ہیں۔ جب میں چھ برس کی تھی۔"

"اوہ!" کورس میں تاسف کا اظہار سب کی طرف سے تھا۔

"تو پھر تم کیا اکیلی رہتی ہو۔ یعنی۔ میرا مطلب ہے کہ۔"

"نہیں۔ ہم اپنے ماموؤں کے ساتھ رہتے ہیں۔ میرے دو ماموں ہیں۔" اس کے انداز میں عجلت تھی۔

اسے لائبریری جانا تھا' صرف ان پیپرز کی وجہ سے یہاں رکنا پڑ رہا تھا۔ اس ۔۔۔۔ کی عجلت چند کو ناگوار گزری۔ منہ پر مارنے کے سے انداز میں پیپرز اس کے سامنے پٹخے گئے۔ اس نے قطعا" برا نہ مانا۔ بیگ کندھے پر رکھے کھڑی ہوگئی۔

اس کی جانب سے متوقع ری ایکشن نہ دیکھ کر پیپر پٹخنے والی لڑکیوں کو اور زیادہ برا لگا۔ جیسے وہ انہیں اہمیت دے ہی نہ رہی ہو۔

"ویسے کلاس میں تو تم خاموش رہتی ہو۔ میرے خیال میں کوچنگ وغیرہ بھی نہیں لیتی ہو۔ نوٹس کی بہت تعریف کررہی تھیں ٹیچر۔ کیا اپنے ماموؤں سے بنواتی ہو؟ یا کسی سے خریدتی ہو ویسے تم خریدنے والی لگتی تو نہیں ہو۔" کہنے والی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور پھر تائید اپنی ہم نوا دوستوں کو بھی۔

"صحیح کہہ رہی ہو' میں واقعی نوٹس خریدنے والی نہیں ہوں۔ اور میرے ماموں۔ بڑے ماموں کی ورکشاپ ہے جہاں اسپیئر پارٹس کا کام ہوتا ہے اور چھوٹے ماموں میٹرک فیل ہیں۔ میں یہ نوٹس لائبریری میں جا کر بناتی ہوں۔ ٹیچر کے لیکچر نوٹ کرلیے جائیں کلاس میں دماغ حاضر رکھا ہو اور چھوٹے سے چھوٹے ٹاپک کے لیے بھی کم از کم چار کتابوں سے ریفرنس لے لیا جائے تو تم سب اس سے بھی اچھے نوٹس بنا کر واہ واہ سمیٹ سکتی ہو۔"

اس نے بہت دھیمے لہجے میں نسخہ کیمیا بیان کیا۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈھیر خود بخود چھٹ رہا تھا۔ اسے راستہ دینے کے لیے۔ "میں وہیں جارہی ہوں' چاہو تو آپ سب بھی آسکتی ہو۔"

اس نے آخری جملہ کسی قدر تیزی سے کہا تھا اور اس سے بڑھ کر تیزی دکھاتے ہوئے وہ کلاس روم سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

ہر تعریف و تنقید سے پرے شجرۃ الدر بہت خاموش کیفیت کے زیر اثر اخبار چہرے کے آگے پھیلائے بیٹھی تھی اس کے رول کیے پراٹھے میں بھنڈی کی بھرت تھی۔ مگر نہ تو اخبار پڑھا جارہا تھا اور نہ ہی شدید بھوک کے باوجود وہ کھانے سے لطف اٹھا رہی تھی۔ بس نوالے حلق سے اتر رہے تھے۔ وہ سطر سطر پڑھ رہی تھی مگر غائب دماغی سی تھی۔ اس کا سارا دھیان کلاس فیلوز کی گفتگو میں اٹکا تھا۔

"تمہارے پیرنٹس بہت خوش ہوتے ہوں گے' والا قیافہ اس کے لیے ایک تکلیف تھا ۔۔۔۔ ارمان تھا جو حسرت میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اور جیسے اب وہ اس حسرت کو بھی فراموش کرچکی تھی۔ اس کے ابو اس وقت اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے جب بچوں کے تالیاں پیٹنے اور ہنسنے رونے ہی کو سراہا جاسکتا ہے۔ یعنی وہ چھٹے برس میں تھی جب وہ فوت ہوگئے۔ پڑھائی لکھائی کے حوالے سے سراہے جانے کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی۔ یقینا" اگر وہ آج ہوتے تو ان سے زیادہ سراہنے والا اس پوری دنیا میں کوئی اور نہ ہوتا۔ مگر وہ نہیں تھے۔ امی تھیں۔ اور دیگر بہت سے لوگ بھی تھے۔ مگر ان سب کو شجرۃ کی کامیابیوں سے کوئی سروکار

نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے جلتے تھے۔ یا کسی بھی قسم کا عناد و بغض تھا۔ دراصل محسنہ اور دیگر اہل خانہ ادراک رکھتے ہی نہ تھے کہ شجرۃ کتنی قابل ہے۔ کتنی محنتی ہے اور کتنی کامیابیاں سمیٹتی ہے۔

محسنہ یہ ضرور چاہتی تھیں کہ وہ پڑھے لکھے اور ضرور ہی کچھ بن جائے اس کے اسکول کی اہمیت اتنی تھی کہ وہ اس کا یونیفارم دھودیتی تھیں اور اس بات کا دھیان رکھ لیتیں کہ کوئی نہ کوئی سوکھا سالن آلو کی بھجیا یا کبھی کبھار انڈا لازمی صبح سویرے موجود ہو جسے وہ اس کے بیچ کے پراٹھے میں رول کر سکیں۔ اس کی کتابوں کے ڈھیر کو سنبھال کر رکھتی تھیں اور ایک ورق بھی ضائع نہ جانے دیتیں۔ یہاں تک کہ گولا بنا کر پھینکے کاغذ کو بھی ہاتھوں سے پریس کر کے سیدھا کر لیتیں اور اسے دکھا کر قطعاً" بے کار کی تسلی کے بعد ضائع کرتیں۔

گھر کا ماحول قطعاً" علمی نہیں تھا۔

بڑے ماموں نے بڑے بیٹے کو اپنے ساتھ ورک شاپ لے جانا شروع کر دیا اور لڑکیاں بھی ماؤں کے ساتھ ہاتھ بٹاتے بٹاتے گھر میں رہ گئیں اور پھر بہت کم عمری ہی میں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔

ایسے لاپروایانہ ماحول میں شجرۃ الدر کی ذہانت و محنت خداداد تھی۔ اور شوق مرحوم والد کی جانب سے لہو میں گردش کرتا تھا۔ وہ اسکول ٹیچر تھے اور محسنہ فقط اتنا لکھنا پڑھنا جانتی تھیں کہ گزارہ ہو جاتا۔ کما کے لانے کے لیے شوہر تھے۔ گھر کیسے چلانا ہے۔ اس کی گائیڈ لائن بھی دے دیتے۔ اور محسنہ ان عورتوں میں سے تھیں جو بنا رد و کد کے شوہر کے بتائے راستے پر چلتی ہیں کہ وہ بالکل درست کہتے ہیں۔ اور ماسٹر عبدالرحیم تو پھر سچ مچ شاندار انسان تھے۔

زندگی نے مہلت نہ دی۔ ابھی تو صرف پوری ب اور آدھی ب کا فرق بتایا تھا۔ اردو اور انگلش میں نام لکھنا سکھایا تھا۔ اس کے ساتھ لہک لہک کر پانچ تک کے پہاڑے یاد کیے تھے۔

دو ایکم دو۔ دو دونی چار۔ دو دائیں دس۔ کہ زندگی کی بس ہو گئی۔

شہر کے دوسرے کونے کے کرائے کے گھر میں عدت گزارنی بھی بہت مشکل تھی۔ وہ تھوڑا بہت سامان سمیٹ کر ہمراہ بچی بھائیوں کے گھر لوٹ آئیں۔ بھائیوں نے کوئی دعوا نہیں کیا تھا سر پر ہاتھ بھی نہ رکھا۔ بنا کچھ کہے ننھے سامان کو سوزوکی میں چڑھاتے رہے۔ بھابھیوں کو اندازہ تو ہو چکا تھا کہ یہ زندگی بھر کی ذمہ داری سر پر پڑی ہے مگر وہ بھی ماں بیٹی کو خود سے لگائے ہچکیاں بھر بھر کے روتی تھیں۔

جوان نند۔ کم سن بچی۔

یہ محسنہ کے ابا کا بھی گھر تھا۔ اور وہ اس میں برابر کی حصے دار تھیں۔ مگر شادی کے بعد اب یہ بھابھیوں کا گھر تھا۔ اور محسنہ احسان مند تھیں۔ انہیں مرحوم ابا اماں کا کمرہ دے دیا گیا۔ ایک الماری۔ پلنگ۔ چار کرسیاں۔ میز چٹائی۔ برتن محسنہ نے خود ہی لا کر باورچی خانے میں رکھ دیے۔

بھابھی نے پرانا کولر پھینک کر محسنہ کا نیا کولر اسٹینڈ میں رکھا تو محسنہ نے کروشیہ کا بنا کور پوش بھی نکال کر اوپر ڈال دیا۔

عدت میں چار ماہ تک گھر سے نہ نکلنے کا حکم ہے مگر گھر کے اندر کونا لینے کی اجازت کوئی نہیں دیتا۔ چار دن تک بھابیوں، بھتیجیوں نے کھانا پانی رکھا اور پانچویں دن محسنہ خود ہی صبح سویرے اٹھ کر آٹا چھاننے لگیں۔ سب کو ناشتہ دیتے دیتے سوئی دس سے اوپر چلی گئی۔ بڑی بھابھی ٹوکری ہاتھ میں لے کر سبزی لینے جا رہی تھیں۔

"آج کیا پکائیں محسنہ۔ یہ بھی روز کی مصیبت ہے۔ اب تم ہی بتادو۔"

"مٹر آلو بنا لیتے ہیں' ساتھ ٹماٹر کی چٹنی۔" محسنہ نے بھی کام میں جتے جتے ہوئے جواب دیا۔ جیسے یہ روز ہی کا معمول ہو۔ "تین دن سے گھوم پھر کے گوشت یا چاول ہی بن رہے ہیں۔" ساتھ وجہ بھی بیان کر دی۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" چھوٹی بھاوج نے تائید کی۔

اور یوں زندگی ایک نئے ٹریک پر یوں چڑھی اور بھاگنے لگی جیسے صدیوں سے بس یونہی ہوتا رہا۔ اور ہوتا رہے گا۔

ایک بے حد نارمل زندگی۔ صبح اور شام کی ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش۔

گھر کا ماحول خوشگوار ہی رہا۔ بیوہ نند مالی لحاظ سے بوجھ نہیں بنی تھی۔ اسے میاں کی پنشن مل جاتی تھی۔ جو بہت قلیل رقم تھی مگر ماں بیٹی کے لیے کافی تھی۔ نوے کی دہائی کا آغاز تھا۔

سادگی کا زمانہ تھا۔ اورنج کلر کے 101 صابن سے مائیں کپڑے بھی دھولیتیں اور بعد میں بچوں کے سر بھی۔ منہ دھونے کا الگ صابن۔ اماں اپنے ہاتھ پر صابن رگڑتیں اور ایک ہاتھ سے چار بچوں کے منہ نبٹا دیتیں۔

لباس ضرورت کی طرح استعمال ہوتا نا کہ نمائش کے لیے۔

خوراک کے نام پر بھی سادگی۔ کبھی کبھار ناشتے کی حلوہ پوری۔ بچے ربوڑیاں اور پاپڑ کھاتے۔ امیروں کا پتا نہیں۔ غریبوں کے گھر میں پھل تبرک ہی کی طرح آتا تھا۔ اور تقسیم ہوجاتا۔

محسنہ کے لیے یہ سب کچھ معمول کا حصہ تھا۔ وہ اسی گھر سے آٹھ سال پہلے رخصت ہوئی تھیں۔ سو آسانی سے ایڈجسٹ ہو گئیں۔ مگر۔ شجرۃ الدر؟

وہ اپنے ابو کی اکلوتی لاڈو تھی۔

ابو اسے بات بے بات سراہتے تھے۔ وہ محسنہ سے زیادہ عبدالرحیم کے قریب تھی۔ ابو بوائز اسکول ٹیچر تھے مگر وہ اسے ساتھ لے کر جاتے۔ وہ چاک اور ڈسٹر پکڑے کمرہ کمرہ گھومتی۔ ابو حساب کے فارمولوں سے پورا تختہ سیاہ بھر دیتے۔ وہ اپنے قد برابر کا کونہ سفید کر آتی رہتی۔ منہ سر سب سفید۔ تھوڑا چاک کھا بھی جاتی پھر۔

محسنہ سے ڈانٹ کھاتی کبھی مار بھی۔ مگر عبدالرحیم کچھ نہ کہتے۔ اکلوتی بیٹی جی جان سے پیاری تھی۔

وہ کسی بھی جماعت میں بیٹھ جاتی تھی۔ سب سے اگلے ڈیسک پر۔ بہت ضد کر کے مانیٹر اور پرفیکٹ دونوں کے بیج بھی سینے پر اکٹھے لگا لیتی۔

اور اب یہاں ماموؤں کے گھر آنے کے بعد کسی کو دھیان ہی نہ رہا کہ اسے اسکول بھی جانا ہے۔ محسنہ عدت سے اٹھیں تو ایک دن اسے گھر کے نزدیکی اسکول میں داخل کروا آئیں۔ اسے اسکول پسند نہیں آیا۔ یہاں اسے سب سے آخری ڈیسک دیا گیا۔ یہ پرائیویٹ اسکول تھا۔ ایک کثیر المنزلہ عمارت۔ اسے گراؤنڈ اور پھول پودے درکار تھے اور بڑا درخت وہاں ابو کے گورنمنٹ اسکول کا گراؤنڈ بہت بڑا تھا۔ وہ بھاگ بھاگ کر تھک جاتی تھی اور ابو نے ایک

درخت پر جھولا بھی ڈلوادیا تھا۔ اسے نئے اسکول میں ہوا کا فقدان لگتا اور اندھیرا محسوس ہوتا۔ اسکول جانے کے نام پر رونا محسنہ کے لیے حیران کن تھا۔ اسے تو اسکول بہت پسند تھا۔

"مجھے ابو والا اسکول پسند ہے امی! ہم یہاں کیوں آگئے ہیں۔ اپنے گھر واپس چلتے ہیں پھر تو میرا وہ اسکول نزدیک ہوگا' دو گلیاں آگے بس۔" اس نے محسنہ کی سخت بازپرس پر دل کی بات کہی۔

"تمہیں سمجھا چکی ہوں شجرۃ۔! وہ گھر ہمارا نہیں تھا۔ اور اسکول بھی نہیں۔"

"وہ میرے ابو کا اسکول تھا امی۔" وہ یوں چلائی جیسے کسی نے دل نوچ لیا ہو محسنہ چلانے پر بھڑکی تھیں خود کو برداشت کا درس دیا۔

"اور ابو اب نہیں ہیں بیٹا۔!"

"تو ابو کہاں گئے۔ آپ انہیں بلالیں میرے بہت مسئلے ہوگئے ہیں امی۔ مجھے بہت سارا کام سمجھنا ہے۔ انگلش کا اور میتھ کا بھی۔ اردو کا میں نے کرلیا۔"

"وہ واپس نہیں آسکتے۔" "تم بچی نہیں ہو شجرۃ۔" محسنہ دانت بھینچ کر چلائیں۔ "یہی ہمارا گھر ہے اور یہی تمہارا اسکول۔ اگر ایسے ہی تنگ کرتی رہیں تو اس اسکول سے بھی چھٹی ہوجائے گی۔ ٹیچر نام کاٹ دیں گی پھر تم رہنا گھر کے اندر۔ گندی بچی بن کر ہاں۔" محسنہ نے تیر نشانے پر لگایا۔ اور وہ ڈر بھی گئی۔

ٹھیک ہے میں جاؤں گی لیکن میں مانیٹر نہیں ہوں اور آگے بھی نہیں بیٹھتی ہوں۔"

"تم اچھی لائق بچی بنو اور فرسٹ آؤ گی۔ تو ٹیچر خود ہی مانیٹر بنادیں گی تمہارے ابو بھی یہی چاہتے تھے تاکہ تم بہت سمارٹ ہو۔"

اور شجرۃ کو ایک بار پھر بات سمجھ میں آگئی۔ اسے پڑھنا ہوگا۔

لیکن یہاں پھر ایک مسئلہ ہوگیا۔ اب ابو تو نہیں تھے۔ وہ اپنا کلاس ورک ماموؤں کے سامنے رکھ دیتی جو تین چار بار پکارنے پر سرسری نگاہ اس پر' آگے بڑھائی کاپیوں پر ڈال کر گال سہلا دیتے۔ اس کے لب کھلنے سے پہلے ہی کہنے لگتے۔

"ہاں ہاں۔ بہت اچھا ہے۔ شاباش۔ تم تو بڑی قابل ہو۔" وہ پھر کسی سے محو گفتگو ہوجائے جبکہ شجرۃ کو پوری تسلی کروانی تھی۔ نقطے لائن رنگ ہر شے ایکسپلین کرنی تھی۔ اور غلطیاں نکلوانی تھیں اور تصحیح کروانی تھی جیسے کہ ابو کرتے تھے۔ لیکن یہ ان کا مزاج نہیں تھا۔ وہ بچی سمجھ کر پچکار دیتے۔ بہلا دیتے مگر پھر آواز لگانے لگے۔

"ماذیہ! آکر دیکھو۔ بہن کیا کہتی ہے۔ محسنہ اسے لے جاؤ۔ جاؤ بیٹا امی سے پوچھ لو یا بھائی سے سمجھ لو۔" کبھی مامیاں پکارتیں۔ "شجرۃ! ادھر آجاؤ۔ ماموں تھکے ہوئے آئے ہیں۔ پانی تو پینے دو۔ تم کیا بستہ لے کر پہنچ جاتی ہو۔"

وہ انہیں بتا نہ پاتی کہ اسے امی سے نہیں پڑھنا اور نہ ہی اپنی تعریف و توصیف کسی اور کو بتانی ہے اسے بس ماموں ہی کو بتانی ہے جیسے ابو کو بتاتی تھی۔ اور پھر ابو جیسے اسے لے کر گھنٹوں بیٹھ جاتے تھے۔ مگر یہاں ماموں۔ اور ماموں کو اس سے کوئی عناد یا چڑ نہیں تھی وہ اس ٹائپ کے تھے ہی نہیں۔ مشینی انسان۔ اپنی نفسیاتی و جذباتی مجبوریوں کی بنا پر وہ پڑھائی پر توجہ نہ دے پاتی جس کے باعث کلاس میں کبھی کوئی خاص مقام حاصل نہ کرپاتی کہ سراہی جاتی۔ الٹا وہ خراب کارکردگی دکھا رہی تھی۔

محسنہ نے سب کچھ سوچ رکھا تھا مگر وہ فیل ہوگی۔ کبھی نہیں۔

"تم پڑھنے پر توجہ نہیں دیتیں شجرۃ۔" محسنہ کو صدمہ ہوا تھا "کیا اپنے ابو کو یہ رزلٹ دکھاتیں۔"

"ابو نہیں ہیں امی!" اس نے ٹھنڈے لہجے میں قصہ ہی ختم کردیا۔ محسنہ دنگ رہ گئیں۔ بہت دیر تک کچھ نہ بول سکیں۔

"لیکن بہت سے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں تم ماسٹر عبدالرحیم کی بیٹی ہو اور ماسٹر عبدالرحیم کی بیٹی کا ایسا رزلٹ؟ لوگ کیا کہیں گے۔" محسنہ کو جملوں کی مار مارنا نہیں آتی تھی' مگر شجرۃ الدرر کو بہت زور سے لگی۔ وہ

چونک اٹھی پوری آنکھیں کھول کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔ محسنہ اپنی بات کہہ کر اٹھ کر جانے لگی تھیں۔ ان کا چہرہ اداس تھا' پرملال۔ وہ شجرۃ کو حسب ضرورت توجہ و محبت نہیں دے پارہی تھیں۔ انہیں اس کی کمی کا ادراک ہی نہیں تھا۔

شجرۃ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر پھر بھینچ لیے پھر دوبارہ نہ تو کبھی محسنہ بولیں نہ شجرۃ۔ جو چند الفاظ محسنہ نے کہہ دیے اس نے گرہ سے باندھ لیے۔

"میں ٹیوشن لگوادیتی ہوں شجرۃ۔ تم اتنا مسئلہ کیوں بنا رہی ہو۔ کلاس میں جو مس بتائیں اسے غور سے سنو اور گھر آکر یاد کرلو۔ اپنا کام پورا رکھو۔ تھوڑی توجہ' تھوڑی محنت بس ہر ایک کے آگے کاپی کیوں رکھ دیتی ہو۔"

اس کے یہ کہنے پر کہ اسے کچھ یاد نہیں ہوتا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ محسنہ نے حل بتایا تھا۔ شجرۃ نے سوچا یعنی ذرا سا غور' توجہ اور ہر شے کو یاد کرلینا۔ یہ تو اتنا مشکل کام نہیں۔

"پھر تم نے بھی تو اپنے ابا کی طرح ٹیچر بننا ہے نا۔" محسنہ نے گرم لوہے پر چوٹ لگائی۔

"ہاں۔ وہ تو مجھے بننا ہے۔" اس کے ارادے واضح تھے۔

"تو بس جو کرنا ہے' تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔" محسنہ اٹھ گئیں۔ انہیں کچن میں بہت کام تھے۔ روایتی متوسط گھرانے کی طرح یہاں کام کے پیچھے لڑائی نہیں تھی۔ محسنہ قطعاً" بھابھیوں کی چاکری نہیں کرتی تھیں' مگر اتنے بھرے پرے گھر میں وہ ایک کام بھی اپنے ذمے لیتیں تو گھنٹوں گزر جاتے۔ مل جل کر ہی کام ہوتے تھے۔ بڑی بھابھی کپڑے دھوتیں تو چھوٹی جھاڑو پوچا کرتیں۔ محسنہ کچن دیکھ لیتیں۔ کبھی ترتیب بدل جاتی' مگر فارغ بیٹھنے کی گنجائش قطعاً" نہیں تھی۔

شام کے وقت مدرسے سے واپسی کے بعد مائیں چیخ چیخ کر بچوں کو دری ڈال کر بٹھا دیتیں کہ ہوم ورک کرلیں۔ وہ سب بیٹھ جاتے' مگر پھر پنسل ربڑ پر جھگڑتے۔ چھینا جھپٹی میں وقت گزرتا۔ اس شور ہنگامے میں شجرۃ کے لیے ایک لفظ پڑھنا بھی عذاب ہوجاتا۔ وہ خاموشی سے بیگ لے کر پچھلی سیڑھیوں میں آبیٹھتی۔ محسنہ کا بتایا نسخہ کیمیا اب ہر مسئلے کا حل تھا۔ وہ ہر شے کو یاد کرتی حلق خشک ہوجاتا' مگر رٹے لگاتی رہتی اور پھر کبھی اسکول سے شکایت نہ آئی پھر کبھی وہ فیل نہ ہوئی پھر کبھی اس نے اپنی کاپی کسی کے آگے نہ رکھی نہ کچھ پوچھنے کے لیے نہ بتانے کے لیے نہ ہی دکھانے کے لیے جبکہ اب اس کی کاپیاں اسٹارز سے رپورٹ کارڈ Good سے بھری ہوتی تھیں۔

اس کی زندگی کا مقصد کورس کی کتابوں کو رٹنا تھا۔ گھول کر پینا تھا۔

وہ ہائیسٹ نمبر لے کر گھر پہنچتی تھی' مگر اب نہ تو چہرہ خوشی سے تمتماتا تھا نہ کچھ بتانے کے جوش سے لب کپکپاتے تھے نہ دکھانے کے شوق میں وہ بھاگی پھرتی تھی۔ محسنہ نے کبھی پوچھا ہی نہیں کہ وہ جو راتوں کو جاگ جاگ کر یاد کرتی ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے جبکہ وہ صبح غیر ارادی طور پر محسنہ کو مصلے پر بیٹھے دیکھ کر کہہ چکی تھی۔

"امی! دعا کریں۔ میرا ٹیسٹ اچھا ہوجائے۔"

محسنہ نے جواب نہ دیا۔ دعا کے بعد کمرے میں پھونک ماری تو وہ خود بخود پھونک کے دائرے میں شامل ہوگئی۔ وہ ناشتے میں گرم چائے کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے ہوئے بھی کتاب پر ہی نظر دوڑا رہی تھی' مگر گھر لوٹنے پر محسنہ نے ایک بار بھی نہ پوچھا کہ ٹیسٹ کیسا ہوا' وہ منتظر ہی رہی۔

سب گھر والے یہ ضرور جانتے تھے کہ شجرۃ پڑھاکو ہے ایک پڑھنے لکھنے والی سیدھی بچی۔ مگر کتنی قابل کتنی ذہین ہے اس کی گہرائی میں کوئی نہیں اترا ہاں وہ محنتی ہے۔ جنون کی حد تک اور کبھی ناکام نہیں ہوئی مہینے میں ایک آدھ بار ماموں اس کی مثال دیتے کہ عقل سیکھو شجرۃ سے۔ کتنی قابل ہے۔

لیکن اس کی قابلیت کسی درجے کی ہے نہ کبھی کسی نے جانا اور نہ سراہا۔

لیکن پھر ایک روز۔۔۔ اور ایک دفعہ۔۔۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے ماموں ساری زندگی ڈیلی ویجز پر کام کرتے رہے' ملی ملی نہ ملی۔ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے وہ ایسی امید و بیم والی زندگی پسند نہیں کرتے تھے۔ نوکری ہو تو سرکاری۔ کم کام۔۔۔ جیئے مرے تنخواہ ملے گی پھر آخر میں ایک ڈھیری نوٹ اور پنشن الگ۔۔۔ دوا دارو بھی ملتا ہے۔ پہلے شہزاد کو سرکاری اسکول میں داخل کروایا گیا۔ پھر جب ارادہ کرلیا کہ اسے فوج میں بھیجیں گے تو اپنے حساب سے ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ اچھا تو پتا نہیں کتنا تھا۔ مہنگا البتہ خوب تھا۔ شروع کے سال تو وہ پاس ہوتا رہا' مگر اب کچھ سالوں سے رزلٹ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ وہ فیل ہو کر اس کلاس میں اٹک گیا یہ سب کے لیے شرمندگی آمیز صدمہ تھا جبکہ ماموں کے لیے معاشی دھچکا۔۔۔ یعنی کہ یونہی فالتو میں اسی پچھلی کلاس میں سال گزارا جائے گا۔ وہی کتابیں' کاپیاں اور فیس ہائے۔۔۔

وہ دندناتے ہوئے اسکول پہنچے اور بدبداتے ہوئے گھر لوٹے۔ پرائیویٹ اسکول کی پرنسپل کو انگلش بولنی آتی تھی' ساڑھے سینتیس منٹ کی گفتگو میں اس نے انگلش بول بول ماموں کا دماغ شل کردیا۔ ماموں ایک جملہ تک نہ سمجھے' مگر یہ ضرور جان لیا' ذلت کسی بھی زبان میں کی جائے۔ حرف بہ حرف پتا لگتی ہے۔ اتنا نالائق بیٹا۔۔۔ سمجھ میں نہ آیا کس منہ سے پرنسپل سے درخواست کریں کہ اسے پروموٹ کردیں' وہ سر دھڑ کی بازی لگادیں گے اسے لائق بنانے کے لیے۔۔۔

"شجرۃ۔۔۔ شجرۃ بات کرے گی پرنسپل سے' اتنی موٹی موٹی کتابیں تو پڑھتی ہے انگلش کی۔" شجرۃ نے حیرت سے سنا اور کوئی بھی تسلی دیے بنا' یقین دلائے بغیر ماموں کے ساتھ نکلی۔

اس نے پرنسپل کا حرف حرف سمجھا کہ وہ اس سے اردو ہی میں بات کررہی تھیں اور جس کا لب لباب یہ تھا کہ شہزاد ریاض انتہا درجے کا نکما لاپروا لڑکا ہے۔ اسے ایک کلاس آگے بڑھانے کی نہیں' پیچھے بھیجے جانے کی ضرورت ہے۔ ماموں کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ شجرۃ کو وعدہ کرنا پڑا۔ وہ چونکہ بقول پرنسپل خود اتنی پڑھی لکھی' سنجیدہ قابل لڑکی دکھائی دیتی ہے تو اسے ہی اپنے بھائی کو پڑھانا ہوگا۔

ماموں خوش ہوگئے اور شہزاد بھی۔ نئی کتابیں خریدی گئیں اور شہزاد دوستوں کے سامنے ہیٹی سے بچ گیا۔ کام ہوگیا تھا۔ سب نے مانا شجرۃ بہت عقل مند ہے۔ کیسے پرنسپل کو قائل کرلیا بھئی واہ۔۔۔

لیکن۔۔۔

مگر۔۔۔ ارے۔۔۔

اگلا دن حیران کن تھا۔ شجرۃ ماموں یا شہزاد کی طرح جان چھڑا کر وقتی وعدہ نہیں کرکے آئی تھی۔ اس نے جو کیا' وہ کسی کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ فرسٹ ایئر میں تھی اور شہزاد سکس کلاس میں۔ قد میں دونوں برابر لگتے تھے تقریباً"۔

اس نے شام کو ہاتھ میں موٹا ڈنڈا پکڑا' اسے پاس بٹھالیا اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ ڈانٹ ڈانٹ کر۔۔۔ کان مروڑ کر' بالوں کے گچھے ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کے۔ آخر میں ڈنڈے سے مار مار کے اسے پڑھانا شروع کردیا۔

"ارے کیا جان لینی ہے لڑکے کی!" چھوٹی مامی کا دل بند ہونے لگا۔

"خبردار مامی! آپ کا کیا خیال ہے' میں وقتی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹا وعدہ کرکے آئی ہوں۔ پہلے سمسٹر میں اچھے نمبر نہ لایا تو دوبارہ بھیج دیں گے پچھلی کلاس میں۔ اسے انسان کا بچہ بنتا ہی ہوگا۔" جملے کے انت میں کتاب اس کے سر پر برسادی' جو گنگ سن رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تیرے لاڈ پیار ہی نے یہ دن دکھایا ہے۔" ماموں نے مامی کو جھاڑ دیا۔ "جیسے دل چاہے پڑھانا' بس اسے پاس ہونا ہے' فوج میں بھیجوں گا اگر کہو تو چمڑے کا بیلٹ بنوا کر لادوں؟"

ہائے۔۔۔ سب کے کھلے منہ پر ہاتھ ٹک گئے۔

اور چار ماہ بعد شہزاد کلاس میں پانچویں نمبر پر آیا تھا۔ ابھی یہ حیرت آمیز خوشی ہی کم نہ ہوئی تھی کہ محلے کے معتبر پڑھے لکھے بندے عبدالغفور صاحب نے ماموں کو روک کر شجرۃ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کردیے۔ ان کی دونوں بیٹیاں نائنتھ کلاس میں اچھے نمبر لائی تھیں اور وہ شجرۃ سے میتھ پڑھتی تھیں۔

"اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں بیٹے کو بھی آٹھویں جماعت کے حساب کے لیے بھیج دوں۔ بیٹیاں بہت تعریف کررہی تھیں بچی کی۔ پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہے۔ شہزاد کو بھی اسی نے چلایا ہے ویسے تو شجرۃ سے سیکھا حساب' میں اسے کرواہی رہی ہیں' مگر وہ ان کے ہاتھ آتا نہیں ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہوتا تو۔۔۔"

دونوں ماموں ایک خوش گوار حیرت میں گھر گئے۔ شجرۃ قابل تو تھی مگر اتنی۔۔۔

"میرے پاس ٹائم نہیں ہوتا ماموں!" شجرۃ نے جواب دیا تھا۔

"ہائیں۔۔۔!" وہ حیران رہ گئے۔

"اور دوسرے جب انعم' ارم کو پڑھایا۔ تب میں فارغ تھی' وہ چھت سے کود کر آجاتی تھیں۔ اب میری اپنی پڑھائی۔۔۔"

"بیٹا! وہ تو تمہاری بہت تعریفیں کررہے تھے' انکار کرتے شرم آئے گی۔ ایک ہی تو لڑکا ہے وہ۔"

"بہرحال اگر وہ اتنا ہی زور دے رہے ہیں تو میں فیس لوں گی۔"

اس بار کا "کیا؟" کورس میں تھا سب حق دق رہ گئے تھے کوئی عزت افزائی کی قیمت لیتا ہے۔

"میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ پڑھانے کی کیا قیمت لوں گی' وقت کی تو لے لوں۔ کام آئے گی۔"

اور خود میں مگن شجرۃ نے شام کے ایک گھنٹے کے لیے ایک کلاس تیار کرلی۔ اسے آگے کالج میں داخلہ لینا تھا۔ اسے بہت آگے جانا تھا۔ کامیاب ہونا تھا' ابو کی طرح ٹیچر بننا تھا۔

اسے اپنے لیے خود راہیں چننا تھیں۔ فیصلے کرنے تھے۔

محسنہ اس سے گھر کا کوئی کام نہ لیتیں۔ وہ دو بجے تک کالج سے آکر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرتی۔ پھر ٹیوشن والے بچے اور پھر گھر کے اپنے بچے جو ماؤں کی کڑی نگرانی میں بیٹھتے تھے سب کو پورے دھیان سے پڑھاتی۔ اس سے بڑے تو پڑھے لکھے بغیر ہی زندگی کی ریس میں شامل ہوچکے تھے' مگر بعد والے اس کے پیچھے چلنا چاہ رہے تھے۔ نئی راہ۔۔۔

اب اکثر معاملات میں اس سے رائے لی جاتی یا اگر اس نے کچھ کہہ دیا ہے تو۔۔۔ لیکن وہ اب ایک خاموش' خود میں مگن لڑکی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی۔۔۔ رات گئے تک پڑھنے لکھنے والی۔۔۔ جس کے اندر کوئی جھانکتا نہیں تھا یا اس نے کھڑکی ہی بند کردی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ پوری کوشش کررہی تھی کہ سر کے لیکچر پر دھیان لگائے' مگر یہ کام ہو رہی تھی۔ چہرے سے لگتا تھا ، موڈ آف ہے۔ مایوس' بے چین اور دل گرفتہ وہ سر کو دیکھنے کے بجائے اپنے گرد بیٹھے دوسرے اسٹوڈنٹ کو دیکھ رہی تھی۔ خاص طور پر ان کو جن کے پاس بے حد ضخیم ڈکشنری موجود تھی۔

سر آج کا کیا لیکچر دے رہے تھے' کچھ پتا نہیں تھا' مگر سر نے پرسوں کیا لیکچر دیا وہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ یاد آرہا تھا اور نئے طریقے سے غم و غصہ میں مبتلا کررہا تھا۔

"انگلش لینگویج سیکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کو ایک سرٹیفکیٹ دے دیا جائے اور آپ منہ بگاڑ کر سوری' تھینک یو' ہاؤ آر یو۔۔۔ آئی ایم فائن تھینک یو جیسے چند لفظ اور جملے بولنا سیکھ لیں۔"

"میں یہاں آپ کو انگلش بولنا سکھاؤں گا۔ درست گرائمر کے ساتھ اور یہ بھی کہ آپ جواب کو مادری

زبان میں تیار کر کے پھر انگلش میں ترجمہ کر کے نہ بولیں بلکہ وہ آپ کی سوچ کے اندر بھی انگلش ہی میں تیار ہو اور اس برق رفتاری کے لیے ضروری ہے۔ ذخیرہ الفاظ اور متبادل الفاظ سے گہری واقفیت اور اس کا بہترین ذریعہ ہے ڈکشنری کا مطالعہ۔“

ٹیچر مسلسل بولتے جا رہے تھے۔

”سو آپ میں سے کتنے اسٹوڈنٹ ڈکشنری رکھتے ہیں؟“ آدھی کلاس کے ہاتھ اٹھے ”کتنے ہیں جو ساتھ رکھتے ہیں؟“ دو اسٹوڈنٹ کے ہاتھ اٹھے۔ ایک کے پاس ڈائجسٹ سائز کی کتاب تھی اور شجرۃ کے پاس اتنی چھوٹی ڈکشنری تھی کہ ہیپ پاکٹ میں آرام سے آجائے۔

”گڈ۔ لیکن میں جس ڈکشنری کا نام لے رہا ہوں وہ یہ ہے۔“ سر نے روسٹرم پر پڑی اپنی ڈکشنری اٹھا کر دکھائی۔ یہ تاریخ کی کسی کتاب کی طرح بے حد موٹی اور وزنی کتاب تھی۔

”جو دو بک آپ نے دکھائی ہیں۔“ انہوں نے شجرۃ اور دوسرے اسٹوڈنٹ کو دیکھا۔ ”یہ چھوٹی کلاسوں میں تو کام آسکتی تھیں مگر اب جب آپ سیریسلی اور پروفیشنلی انگلش کو اپنانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر یہی والی... یا اس جیسی کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے اپنی بک پر ہاتھ بجایا۔ سر نے اپنی بکس اسٹوڈنٹ کی جانب بڑھا دیں۔ شجرۃ بھی بہت جوش سے دیکھنے بڑھی۔

سب اوراق پلٹ رہے تھے مگر جب شجرۃ کی باری آئی تو اس نے بہت تیزی اور جوش سے قیمت ڈھونڈی تھی اور... اور... جیسے تڑپ کر رہ گئی اتنے زیادہ پیسے۔ اس نے تین ہندسوں والی قیمت کو بے یقینی سے دیکھا۔ محسنہ اسے مخصوص رقم دیتی تھیں اب جبکہ اس کی اپنی پڑھائی بہت زیادہ وقت مانگتی تھی، اس نے صرف تین بچے ٹیوشن کے رکھ چھوڑے تھے اور اس فیس میں کچھ پیسے وہ محسنہ سے لے کر اس بے حد مہنگے انسٹیٹیوٹ کی فیس ادا کر رہی تھی اور اس پر اتنی مہنگی کتاب اف... محسنہ سے کچھ کہنا فضول تھا۔ پنشن کی محدود رقم بنا کسی کے کہے سنے گھر میں خرچ ہو جاتی۔ محسنہ نے کچھ کمیٹیاں ڈال رکھی تھیں۔ آخر کو انہیں کل کو شجرۃ کو بیاہنا تھا۔ اپنی شادی کا ڈھائی تولے کا سیٹ بھی سنبھال رکھا تھا اور وہ کتابوں کے لیے اتنی پاگل ہو رہی تھی کہ اگر ممکن ہوتا تو ایک انگوٹھی یا بندہ ہی دے کر کتابیں لے آتی۔

مگر چونکہ یہ ہوا نہیں تھا اور ہونا ممکن بھی نہیں تھا سو اس وقت وہ ساری دنیا سے اور خود سے بھی خفا ہو کر بیٹھی تھی۔

کچھ اسٹوڈنٹ نے اپنی کتابیں دکھا دی تھیں۔ کچھ دو ایک روز میں لانے والے تھے اور وہ...

”شجرۃ! آپ کچھ نہیں بولیں۔“

اپنے نام کی پکار پر وہ چونک کر کھڑی ہوئی۔ سر اس سے پوچھ رہے تھے۔

”سوری سر... میں بکس نہیں خرید سکتی۔ یہ بہت مہنگی ہیں۔ میری پرچیزنگ پاور سے باہر...“ اس کی آواز واضح اور دوٹوک تھی۔ بے جھجک...

سر سمیت سب یک دم اسے دیکھنے لگے۔

”اوہ... آئی سی...“ سر نے چشمہ ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے بغور دیکھنے لگے اس نے پلکیں نہ جھپکیں... مایوسی کا شائبہ تک چہرے پر نہ تھا۔ سر کو یہ اعتماد اور سچائی بھائی تھی۔ وہ چند پل خاموش رہ کر دل سے مسکرائے۔

”آپ کو ضرورت محسوس ہو تو آپ کلاس میں کسی سے بھی ہیلپ لے سکتی ہیں۔ اے کم آن کلاس! شجرۃ کو آپ سب کتابیں پڑھنے کے لیے دیں گے؟“

”ییس سر! آف کورس سر...!“ سب یک آواز بولے۔

”اور میں تو ہوں ہی۔“ سر نے چشمہ دوبارہ ناک پر ٹھہرایا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تھینک یو سر...!“ وہ خود اعتمادی سے بیٹھ گئی تھی۔



”ہے ہیلو... ہیلو... شجرۃ الد... شجرۃ الدر...“

ہجے سے پڑنے والی پکار میں اس کے نام کو درست تلفظ سے لینے کی کوشش نمایاں تھی۔

وہ چونک کر مڑی اور سینے پر ہاتھ لپیٹ کر اسے بغور دیکھا۔ وہ سنان الیاس تھا۔ کلاس فیلو۔ ”شجرۃ... الدر... شجرت ’ال‘ ’در‘۔“ اس نے اپنا نام توڑ کر ٹھہر ٹھہر کے اس طرح بتایا کہ دوبارہ زیر زبر کی غلطی نہ ہو۔

”تو ہاں... سوری تمہارا نام خاصا مشکل ہے۔“ وہ بھاگ کر آیا تھا سو سانس بحال کر رہا تھا وہ کچھ نہ بولی۔

”تم میری بکس لے سکتی ہو۔ یہ ڈکشنری اور یہ گرائمر بک، یہ اس کا نیو ایڈیشن ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر دیے تھے مگر شجرۃ کی آنکھوں میں حیرت آ رکی اور پھر سوال۔

”تم ہی کیوں بھئی... سر نے اکیلے تم ہی کو تو نہیں کہا۔ کوئی بھی دے دے اور وہ بھی جب مجھے ضرورت ہوگی۔“

”ہاں، سر نے یہی کہا ہے مگر جب تین دن پہلے میں یہ بک خرید رہا تھا۔ تب تم بھی دکان میں آئی تھیں۔ تب گرائمر بک کی ایک ہی کاپی تھی۔ اس سے پہلے کہ دکاندار تمہیں دے دیتا میں نے تیزی سے پیسے پکڑا کر لے لی۔ مجھے بس شرمندگی سی ہو رہی تھی اس لیے۔“

”تمہاری شرمندگی فضول ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنے گئی تھی کہ کتنا کنسیشن مل سکتا ہے مگر...“ اس نے اب تک کتابیں پکڑی نہیں تھیں۔

”تم جو بھی کرنے گئی تھیں مگر... تم انہیں رکھ لو۔ مجھے فی الوقت ضرورت نہیں ہے۔“

”کیوں تمہیں کچھ نہیں پڑھنا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”پھر خریدی کیوں تھیں؟“

”پڑھنے ہی کے لیے لی تھیں مگر آج کل میں کچھ اور پڑھ رہا ہوں۔ یونہی الماری میں پڑی رہیں گی۔ تم دیکھ لو آئی سوئیر میں سچ کہہ رہا ہوں۔ شجرۃ ال... در...“

وہ اس کے نام پر پھر اٹک گیا تھا جو نظروں کو ایکسرے مشین بنائے جیسے اندر کا سارا بھید جان لینا چاہتی تھی۔

”شجرۃ الدر...!“ اس نے ٹھنڈا سانس لے کر دوبارہ نام کا صحیح تلفظ ٹھہر ٹھہر کر دہرایا۔ ساتھ ہی ہاتھ آگے بڑھایا کہ کتابیں دے دے۔

سنان کے چہرے پر طمانیت و مسرت پھیل گئی۔

”کل سنڈے ہے ٹیوز ڈے کو واپس لاؤں گی۔“ وہ ورق پھڑپھڑانے لگی تھی۔

”نہیں، نیکسٹ ویک تک رکھ لو۔ کوئی ایشو نہیں۔“ وہ ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ شجرۃ کو اسی لینگویج کلاس میں دیکھا تھا۔ صرف نام سے واقف تھا اور یہ کہ اس کا تمام ہوم ورک کمپلیٹ ہوتا ہے۔ سر کا دیا جانے والا تمام کام وہ جیسے گھول کر پی کے آتی تھی۔ ویسے خاموش، خود میں گمن قطعاً ”نوٹس“ میں نہ آنے والی لڑکی تھی کہ کلاس میں ایک سے ایک طرح دار لڑکیاں موجود تھیں جو خود کو اجاگر کرنے کے فن سے بخوبی واقف تھیں۔ ایسے میں شجرۃ اپنے کالج یونیفارم ہی میں ہوتی تھی۔ سیاہ بڑے منہ والے جاگرز... صبح گھر سے نکلتے وقت جو چوٹی گوندھتی، وہ تین بجے تک اُجڑ بجڑ جاتی۔ اس کے چہرے پر تکان ثبت ہوتی۔ عام سی شکل و صورت تھی نمکین سی رنگت چمک دار شفاف بے داغ جلد کی وجہ سے گندمی لگتی تھی۔ البتہ آنکھیں بہت خوب صورت تھیں، کالی سیاہ گہری ان میں اداسی بھی تھی سنجیدگی اور ذہانت بھی جو دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی تھی لیکن اس کی بے نیازی کسی کو قریب نہیں ہونے دیتی تھی۔

چھٹی سوا ایک بجے ہوتی تھی۔ وہ اس کے بعد کا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کالج ہی میں گزار دیتی کہ گھر جا کر دوبارہ آنا فزیکلی تو مشکل تھا ہی مگر فنانشلی ناممکن... وہ سارا دن خوار ہوتی پانچ ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ پاتی۔

ایسی نڈھال، حساب کتاب میں الجھی لڑکی کسی کی نگاہ میں نہیں تھی، کوئی اسے نہیں جانتا تھا مگر آج چند جملوں نے ساری حقیقت آشکار کر دی تھی۔

”دس دن تک کے لیے رکھ لوں؟“ شجرۃ کے چہرے پر پہلی بار اچنبھا پھیل گیا۔

”ہاں۔ رکھ لو۔“ وہ بے پروائی سے اپنا بیگ کمر پر

سیٹ کررہا تھا۔

"تو تم کیا کرو گے۔ اتنے دن تک۔۔ کیا پڑھو گے؟"

"میرے پاس دو تین ڈکشنریز اور بھی ہیں' ضرورت ہوئی تو مانگ لوں گا ویسے بھی میں نے کہا نا میں آج کل کچھ اور پڑھ رہا ہوں۔"

"کچھ اور۔۔ کچھ اور کیا پڑھ رہے ہو؟" وہ حیران ہوئی ایسا کیا کہ اتنی اہم بکس کو سرسری لے رہا ہے۔

"میں تو خیر کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے بغلوں کے پاس بیگ کے فیتے سیٹ کررہا تھا۔ "لیکن آج کل "نسخہ ہائے وفا" پڑھ رہا ہوں۔ بعض جگہ مشکل لگتا ہے اور بعض جگہ اتنا خوب صورت کہ پڑھ پڑھ کے دل نہیں بھرتا۔ کبھی پوری غزل پر اٹک جاتا ہوں کبھی مصرع پر اور کبھی صرف ایک لفظ پر بھی۔۔ تم نے تو۔۔"

"کیا پڑھ رہے ہو۔۔ نسخہ۔۔؟" وہ چونکہ بولتے وقت بھی مسحور کن کیفیت میں گھر گیا تھا اور لہجہ قدرتی تیز تھا' لہٰذا شجرۃ کو اس کے تمام جملے سر سے گزرتے محسوس ہوئے۔

"نسخہ۔۔ نسخہ۔۔ وفا۔۔ تم کیا کوئی حکیم ہو۔۔ حکمت وغیرہ کرتے ہو؟"

"واٹ۔۔!" وہ بھونچکا رہ گیا۔ ایڑی پر ہلتا لاپروا انداز۔۔ وہ اچھلا تھا اور پھر جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ جنبش سے بھی قاصر۔۔ اور وہ ابھی تک جواب کی منتظر تھی۔

جینز کی پینٹ' جاگرز جیکٹ۔ بالوں کی تراش بہت جاذب نظر تھی اور وہ اچھا خاصا اوں۔۔ ہوں۔۔ خاصا اسمارٹ تھا۔ ماموں جن حکیم صاحب سے دوا لایا کرتے تھے۔ وہ تو دبلے پتلے تنکے سے تھے ساری کمزوریوں کا علاج ان کے پاس تھا۔ بس اپنے جسم پر پاؤ بھر بوٹی بھی پیدا نہ کرسکے اور ان کے دونوں بیٹے بھی ان کی فوٹو کاپی تھے تو پھر کیسا حکیم تھا اور اپنے پیشے سے اتنا مخلص کہ باقاعدہ کتب بینی کرتا ہے' واؤ۔۔۔

وہ حیران تھی اور وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے سر پر توبوزاگ آیا ہو۔



"میں نے تمہیں دس دن تک کے لیے دی تھیں اور تم آج تیسرے دن ہی واپس لے آئیں۔" اس نے حیرت سے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر کتابیں لے لیں۔

"ہاں تم نے دس دن تک کے لیے دی تھیں۔" اپنا بیگ کرسی کی بیک سے لٹکاتی بیٹھ گئی وہ ابھی ابھی انسٹیٹیوٹ پہنچی تھی۔ سانسیں کسی قدر منتشر تھیں۔ جھک کر جاگرز کے لیس کو کسا۔

"مگر میں ایک الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ واپسی کے خیال میں چونکہ دن گننے تھے کہ تین ہو گئے اور سات رہ گئے تو ارتکاز پیدا نہ ہوسکا۔ بے چینی سی تھی اور پھر سچ کہوں' لیتے وقت دل کے کس کونے میں خیال تھا۔ ساری کی ساری فوٹو کاپی کروالوں' مگر وہ کام مشکل تو تھا ہی مہنگا بھی لگا بس اس لیے۔"

"عجیب بات کرتی ہو تم۔۔ تم جب دل کرتا واپس کرتیں' میں نے تمہیں کہا تھا نا۔" وہ عجیب سی منطق سن کر حیران تھا۔

"تمہیں کچھ نہیں کہہ رہی بس بے سکونی سی تھی۔ پھر میں نے اس دن کہا تھا نا کہ میں افورڈ نہیں کرسکتی' مگر کچھ جوڑ توڑ کیا ہے' میں عام طور پر اپنی امی سے پیسے نہیں مانگتی مگر پھر سوچا پوچھوں تو سہی۔ تو وہ کہنے لگیں' وہ کوشش کرکے عنقریب لے دیں گی۔ بس اسی لیے۔"

"آئی سی۔۔" وہ سمجھ گیا۔ "ایسا کرو تم چندہ کرلو۔ تھوڑے بھائیوں سے مانگ لو۔۔ تھوڑے بھابھیوں سے۔۔ بہنوں سے بھی اور ہاں ابو سے۔۔ میں تو جب بھی فنانشل کرائسز میں گھرتا ہوں' ڈونگے کا کاسہ کر سب کے آگے پہنچ جاتا ہوں اور کہتا ہوں۔ کوئی زور زبردستی نہیں' حسب توفیق عنایت کی جائے میری شکل پر مت جائیں۔ میری اوقات مت دیکھیں۔ اپنی اوقات کے حساب سے دیں' ضرورت دو سو کی ہوتی ہے پر جمع ہمیشہ ڈبل ہو جاتے ہیں۔"

وہ بڑے مزے سے گھر کی بات بتا رہا تھا اور شجرۃ کی آنکھیں پھیلی جارہی تھیں۔ وہ اس کے سنائے سین پارٹ کو وژولائز کرکے دیکھ رہی تھی اور کری ایشن

مکمل ہونے پر مسکرائی اور پھر بہت زور سے ہنس دی۔ اس نے اس کی ہنسی پر اسے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔

"تم شاید مذاق سمجھ رہی ہو۔ یقین کرو میں ایسے ہی کرتا ہوں۔"

"بلکہ۔۔" وہ اس کی جانب رخ موڑ کر بیٹھ گیا۔ "تم بھی ایسے ہی کرنا دنوں میں مالی بحران سے باہر آؤ گی۔" اس نے چٹکی بجائی۔

شجرۃ نے ہنسی روکی۔ آنکھ میں آیا پانی انگلیوں کی پور سے پونچھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ متوقع نگاہوں سے کہ وہ ترکیب کو سراہے اور ہامی بھی بھرے۔

"میں ایسا نہیں کرسکتی۔ ہمارے گھر میں صرف جمعرات کو آنے والے فقیروں کو دو دو روپے دیے جاتے ہیں اور دوسرے میرے بھائی بھی نہیں ہیں اور نہ بہنیں۔۔ میں اپنی امی کے ساتھ ماموں کے گھر رہتی ہوں اور ان کے زیادہ تر بچے مجھ سے چھوٹے ہیں صرف ایک روپیا لیتے ہیں چیز کھانے کے لیے۔ ابو میرے تب فوت ہوگئے تھے جب میں چھ برس کی تھی۔"

تھوڑی دیر پہلے کا ہنستا تاثرات سے بھرپور چہرہ اچانک سپاٹ ہوگیا۔ وہ اپنی بات کہہ کر جیسے اس کے وجود کو بھی نظرانداز کر گئی۔ پیچھے لٹکتا بیگ آگے کیا۔ نوٹ بکس اور قلم نکال کر بالکل سیدھا بیٹھ گئی۔ نگاہیں بلیک بورڈ پر تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے اسٹاپ کہہ دیا ہو۔

"آئی ایم سوری۔" سنان کی آواز دھیمی تھی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا میرے فادر کی بھی ڈیتھ ہوچکی ہے۔ جب میں نائنتھ کلاس میں تھا' مگر میری ماشاء اللہ بڑی فیملی ہے امی ہیں اور بھائی۔۔"

"گڈ آفٹرنون سر۔۔!" ساری کلاس کی کورس میں آواز اور ہیڈ ڈیڑھ وہ دونوں بھی چونکے اور تیزی سے کھڑے ہوگئے۔ سر آگئے تھے۔



"ارے ہیلو۔۔ شجرۃ۔ تل در۔۔ ہیلو سنو شجرۃ رکو۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ موسم سرد اور اوپر سے بادل۔ اسے شام پانچ بجے ہی اندھیرے کا احساس ہو رہا تھا۔ گھر جانے تک تو گھپ سیاہ رات پڑ جانی تھی۔

وہاں لینگویج کلاس میں پکارنا یا بات کرنا اور بات ہے لیکن ایسے سر راہ۔۔ اس کے چہرے پر سوال اور ماتھے پر ناگواری کی لکیر ابھر چکی تھی۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک زبردست سلوشن ہے۔ آئی مین میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔ تم میرے ساتھ اولڈ بکس اسٹالز پر چلو۔" لہجے میں ایکسائٹمنٹ انتہا کی تھی۔ عجلت یقین اور خوشی بھی' مگر شجرۃ نے فقط "میرے ساتھ چلو" کو سنا تھا۔ سابقے لاحقے سنے ہی نہیں جیسے۔

اور سنان نے بھی ایک لمحے کے توقف کے بعد جیسے شجرۃ کی سوچ پڑھ لی۔ وہ یک دم چپ ہوا تھا۔ "میرا مطلب ہے تم سیکنڈ ہینڈ بکس خرید لو۔ آدھی قیمت پر۔ نئی نہیں خرید سکتی ہو تو۔۔ تمہیں خود خیال کیوں نہ آیا؟"

شجرۃ بدمزہ ہوئی۔

"میں نے پتا کرلیا تھا' مگر سرسید اردو بازار سے صرف کورس سے ریلیٹڈ بکس ملتی ہیں اور۔۔"

"ارے نہیں۔ پرانی کتابوں والے فٹ پاتھوں سے دنیا کی ہر کتاب ملتی ہے۔ ڈھونڈنے والی آنکھ اور ہاتھ چاہئیں بس۔۔"

"کون سے فٹ پاتھ؟ یہ کہاں ہیں؟"

"شہر میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور میں سب جانتا ہوں' میں تمہیں لاکر دے سکتا ہوں' بالکل سیم نہ بھی ملی تو تمہارا کام ہو جائے گا بلکہ بعض اوقات توقع سے بڑھ کر اچھی ملتی ہیں۔ سر کی بتائی ہوئی سے بھی اچھی۔۔"

"تو یہ جگہ کہاں ہے۔ نزدیک ترین بتاؤ۔" اسے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ "میں زیادہ دور نہیں جاسکتی۔"

"اوکے۔ تو پھر میرے ساتھ کریم آباد چلو۔ بارہ پندرہ ریڑھیاں تو ادھر بھی ہیں اور مجھے یقین ہے' مزید

کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" شجرۃ نے چند پل سوچا پھر اثبات میں سرہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

شجرۃ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے ڈکشنری کتابیں ٹٹولنے کے پندرہویں منٹ میں مل گئی اور لینگویج گائیڈ بک پون گھنٹے میں۔ اسے یہ بھی یاد آگیا کہ کورس کی کتابوں میں ایک ریفرنس بک جو کہیں نہیں ملی تھی اس کے ہی جیسی ایک بک یہاں تھی۔

دن کے دو بجے کا وقت تھا اور دکانیں ابھی کھلی ہی تھیں۔ اس کے پیچھے بازار فیصل تھا اور عین سامنے مینا بازار۔

"حیرت ہے، تم یہاں کبھی نہیں آئیں؟" سنان سچ مچ بے یقین تھا۔

"کیوں... تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو۔ یہاں آنا کیوں ضروری تھا؟" وہ سوال پر حیران تھی۔

"یار! مجھے تو تم اس دنیا کی لڑکی لگتیں نہیں لڑکیاں تو اتنی شارپ ہوتی ہیں۔ اندر بیوٹی پارلرز ہیں لاتعداد... جنہیں عورتیں ہی چلاتی ہیں۔ مہندی، شادی، میک اپ فیشن کے تمام کام ہوتے ہیں بلکہ پورے پاکستان میں سب سے کری ایٹو مہندی کی ڈیزائننگ یہیں سے نکلتی ہے۔ پورے ملک میں سپلائی ہوتی ہے مینا بازار کی کون مہندی اور تم کہتی ہو کہ..."

"اچھا!" شجرۃ کا چہرہ یک دم پر سکون ہو گیا۔ "تو یہ وہ مینا بازار ہے جہاں سارے کورسز بھی کروائے جاتے ہیں۔" اسے یاد آگیا۔ "بیوٹیشنز وغیرہ کے۔"

"تم یہاں کبھی نہیں آئیں؟"

"نہیں کبھی نہیں..." اس بار سنان کچھ نہ بولا۔ بس اسے دیکھ کر رہ گیا جو چند منٹ تک سامنے بنی طویل عمارت کے کونوں کھدروں کو کھوجنے کے بعد اب زمین پر بیٹھ کر نیچے پڑی کتابوں کے ڈھیر کو جانچ رہی تھی۔ وہ بھی پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"سنو سنان! جب مردوں کا جانا ممنوع ہے تو تم کو کیسے اتنی معلومات ہیں تم نے کیسے دیکھا۔"

"ارے!" وہ پہلے مسکرایا پھر زور سے ہنس دیا۔

"چار میری بہنیں ہیں، تین بھابھیاں اور ایک امی... بچپن میں امی کے ساتھ اندر تک چلا جاتا تھا۔ دس برس پہلے تک۔ اب بہنوں بھابھیوں کے ساتھ آتا ہوں اور احمقوں کی طرح ان کا انتظار کرتا ہوں۔ وہ چار چار گھنٹے بعد برآمد ہوتی ہیں۔ مہندی سے لپی پتی سرخ چہرے... اپنی طرف سے اچھی بن کر آتی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے، پٹ کر آئی ہیں۔ سوجے منہ۔ ساری کمائی جھونک دیتی ہیں اپنے میاں کی اور وہ دیکھو اس لڑکی نے کتنی مہندی لگا رکھی ہے۔ میری نمبر دو والی بھابھی کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔"

شجرۃ نے اس کے اشارے پر سامنے دیکھا۔ لڑکی نے شلوار اوپر تک چڑھا رکھی تھی۔ آدھی پنڈلی برہنہ تھی اور بیل بوٹوں سے چھپی ہوئی تھی۔ دونوں کلائیاں کہنی تک مہندی سے بھری ہوئیں۔ دونوں بازو سر سے اوپر تک اٹھا رکھے تھے۔

"ایسے لگتا ہے یہ مدد کی طالب ہے کہ جیسے سیلاب آگیا ہو۔ پائنچے گیلے نہ ہوں تو مقدور بھر چڑھا لیے اور ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنس پڑی۔ پھر اس کے ہاتھوں میں کتابوں کا ڈھیر دیکھ کر بولی۔

"ارے ہاں۔ تم نے اتنی دیر میں کیا ڈھونڈا، میں تو کامیاب ہو گئی۔ تمہیں کیا ملا دکھاؤ۔" وہ اس کے کچھ نزدیک سرک آئی تو اس نے ایک کے بعد ایک اپنی کتابیں اس کے آگے بڑھانی شروع کر دیں۔

شجرۃ کے لیے کتابوں کے نام اجنبی تھے اور لکھنے والوں کے بھی...

یہ بہت پرانی اور کافی حد تک بوسیدہ کتب تھیں مگر سنان بہت خوش نظر آتا تھا۔

"کیا یہ سب تمہارے کورس کی کتابیں ہیں؟" وہ اچنبھے کا شکار تھی۔ یہ سب شاعری تھی۔

"تم ان کتابوں کو لینے آتے ہو ادھر؟"

"صرف ادھر ہی کیوں؟ جہاں سے بھی ملنے کا گمان ہو، سب سے پہلے پہنچنے والا میں ہی ہوتا ہوں۔"

"مگر کیوں؟ کس لیے؟"

"کس لیے کا مطلب؟ اس لیے کہ مجھے شعر و شاعری سے عشق ہے، لفظوں کا کھیل مبہوت کر دیتا ہے مجھے۔ سحر زدہ، ششدر... سکون عطا کرتا ہے۔ کیا تم نے کبھی شاعری نہیں پڑھی۔"

"ہاں بس... یاد کی تھی۔ وہ جب کورس میں ہوتی تھی۔"

"شاعری یاد کرتے ہیں؟" وہ چلایا تھا جیسے۔

"تو کیا نہیں کرتے۔" وہ اس کے ردِ عمل پر حیران ہو گئی۔

"بالکل نہیں کرتے، یہ تو خود بخود دل و دماغ میں اتر جاتی ہے، کون پاگل شعروں کے رٹے لگاتا ہے؟"

"خیر شعروں کے رٹے تو میں نے کبھی نہیں لگائے۔" اس نے اپنی صفائی دینی شروع کی۔ "مگر میں شاعری کے بارے میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اچھی تشریح سے آپ فل مارکس لے سکتے ہیں۔"

اس نے صاف گوئی کی حد کر دی اور حقیقت پسندی کی انتہا۔ سنان کو لگا کسی نے اس کے سر پر زور سے ڈنڈا مار دیا ہو۔

"تمہارے نزدیک شاعری صرف تشریح کے لیے ہے، ایگزام میں فل مارکس کے لیے؟ کبھی کوئی شعر دل میں نہیں کھبا؟"

"نہیں۔" اس نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"غالب، جوش، میر تقی میر، درد، سودا، ساغر، ساحر اور اور..." سنان نے رٹو طوطے کی طرح نام دہرانے شروع کیے۔ "ان میں سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں سنا؟ کچھ نہیں جانتیں ان کے بارے میں؟"

شجرۃ نے چند لمحے رک کر تمام ناموں کو ذہن میں دہرایا۔

"نہیں۔ ان میں سے کچھ کو جانتی ہوں۔ ہماری اردو کی ٹیکسٹ بک میں ان کی پوئٹری ہے۔ جیسے غالب، ہاں علامہ اقبال کو جانتی ہوں، شاعر مشرق اور میر تقی میر... اور میر انیس مرثیہ گو، یہ بھی پتا ہے، لیکن؟" وہ رک گئی۔

"میر جعفر اور میر صادق کے بارے میں بھی سنا ہو گا۔ یہ کیسے شاعر تھے؟" سنان کے سر پر لگ چکی تھی۔

"میر جعفر... میر صادق..." شجرۃ نے ہونٹ دبائے، وہ آنکھیں سکیڑ کر سوچنے لگی تھی۔ "یہ دونوں تو وہ نہیں جو ٹیپو سلطان کے غدار تھے؟" اس نے ثابت کر دیا تھا۔ اسے شاعری سے دلچسپی نہیں مگر اس کا علم محدود یا چھولے دے کر حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔

"یہ دونوں غداری کے علاوہ شاعری بھی کرتے تھے؟" اس نے سنان سے پوچھا۔ اب اس سے بڑھ کر کون درست معلومات دیتا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ دونوں شاعر بھی تھے۔" سنان نے سوچا، خود کشی کا آسان فوری طریقہ کیا ہے۔

وہ روڈ پر چت لیٹ جائے؟

سامنے کھمبے کے ننگے تاروں سے لپٹ جائے

یا اونچے اوور ہیڈ برج سے کود کر جان دے دے؟

اس نے شجرۃ کو دیکھا جو ہنوز جواب کی منتظر تھی۔

"اللہ!" اسے خدا یاد آیا۔

☼ ☼ ☼

شجرۃ گھر میں داخل ہوئی تو بہت خوش تھی۔

مگر گھر میں گھستے ہی اس کی مسکان دم توڑ گئی۔ رونے کی آواز بلند تھی مگر ایک سناٹا سب پر طاری تھا۔ حیرت، خوف زدگی اور مختلف اوہام سے پہلے ہی۔ وہ آواز پہچانی اور فقط دو جملے سن کر وجہ بھی جان گئی۔ اس نے طویل لمبا سانس لیا۔

یہ ہما بھابھی کی آواز تھی۔ بڑے ماموں کی اکلوتی بڑی بہو جو اولاد سے محروم تھیں۔ گھر کی بڑی خواتین خاموش تھیں، کبھی کبھار تسلی کا بول بول دیتی تھیں۔ آفاق بھائی بھی ہاتھ میں براؤن لفافہ لیے بالکل ساکت بیٹھے تھے اور شجرۃ نے ان سب کے چہرے اور پھر لفافے کو دیکھ کر مضمون بھانپ لیا تھا۔

"میں کتنا خوش تھی اور ڈاکٹر کہتی ہے کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ الٹرا ساؤنڈ میں کچھ نہیں ہے۔ مجھے اتنا غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ تمہاری مشین خراب ہے اور

تم نکمی ڈاکٹر ہو۔ ہم دوسری ڈاکٹر کے پاس گئے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان رو رہی تھیں۔ "وہ بھی یہی سب بولی۔"

"بہت سارے ٹیسٹ بھی لکھ کر دے دیے ہیں۔" آفاق بھائی نے بھی جملہ جوڑا۔ بھابھی کے رونے میں شدت آگئی۔

"تو چلو۔ اب وہ ٹیسٹ بھی کروالو ناں جو ڈاکٹر نے کہے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہوگا تو علاج شروع کریں گے۔" محسنہ نے کہا۔

"پہلے ٹیسٹ پھر علاج۔ اور وہ بھی کامیاب ہوگا کہ نہیں اور کب تک؟ مجھ سے ایک دن صبر نہیں ہوتا پھوپھو! اور اس بار آپ سب ہی نے کہا کہ کچھ ہے' مجھے تو جیسے ڈاکٹر نے پہاڑ سے دھکا دے دیا۔" ہما نے تڑپ کر جواب دیا تھا۔

"بس جب اللہ کا حکم ہوگا۔" مایوسی' دکھ' بے چینی آفاق کے چہرے پر بھی تھی اور لہجے سے بھی عیاں تھی۔ وہ لفافے کو تخت پر رکھتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ ایک نظر سب پر ڈالی اور باہر کو نکلے۔ چال سے بھی شکستگی اور تاسف نمایاں ہو رہا تھا۔

"ان کا ٹیسٹ بھی بولا ہے ڈاکٹر نے۔" ہما بھابھی کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ کچھ جھجکا ہوا ڈرا سا' تینوں خواتین چونک گئیں۔ اور باہر نکلتے آفاق بھائی بھی تیزی سے گھومے۔

"تو میں نے کب انکار کیا ہے۔ کروالوں گا۔ ٹیسٹ ہی تو ہے۔ پتا تو لگے کہ کیا وجہ ہے؟" ہما بھابھی آنسو پونچھنے لگیں۔ لفافہ سنبھالنے لگیں۔ اسی میں ٹیسٹ لکھا ہوا تھا۔

محسنہ اور دونوں مامیاں ازحد حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں' آدمیوں کے ٹیسٹ کب ہوتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر بھی ناں۔

محسنہ' ہما بھابھی کو پچکار رہی تھیں۔ آنسو پونچھ رہی تھیں۔ شجرہ کے دل پر غبار سا چھانے لگا اس نے صبح نکلتے وقت محسنہ سے کہا تھا۔ وہ آج کتابیں' ڈھونڈنے کے لیے کہیں جائے گی۔ دعا کریں کامیابی ہو۔ وہ موٹی موٹی کتابیں اٹھا کر گھر لوٹی تھی۔ محسنہ نے اس کا چہرہ دیکھا جو کامیابی کو دکھا رہا تھا۔

لیکن۔

وہ اب تک اندر نہیں آئی تھیں کہ "شجرہ کتابیں مل گئیں۔ پیسے کم تو نہیں پڑے یا بچ گئے ہیں تو لوٹا دو۔ اور آج تم کافی لیٹ آئی ہو۔ کہاں گئی تھیں' کس کے ساتھ گئی تھیں؟"

سب اس پر اعتماد کرتے ہیں یہ خوشی کی بات تھی مگر اس کی فکر نہیں کرتے۔

اس نے کم عمری سے اپنے لیے فیصلے لینے شروع کردیے تھے آٹھویں جماعت میں اس نے اسکول میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کا نام سائنس اسٹوڈنٹ کی فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ اس نے گھر آکر محسنہ سے مدد مانگی کہ وہ سمجھ نہیں پارہی کہ وہ سائنس لے یا آرٹس۔ اور محسنہ نے جواب دیا تھا۔

"بھئی۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جو تمہیں ٹھیک لگے۔ اب تم کو ہی معلوم ہوگا ناں کہ تم کیا پڑھ سکتی ہو کیا نہیں" محسنہ اٹھ گئیں۔ گیند اس کے کورٹ میں۔

بہت بچپن ہی سے اسے جو چیزیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے پڑجاتی تھی۔ چیز سمجھ میں نہیں آئی مگر رٹے لگا لگا کر اسے ازبر ضرور ہوجاتی تھی۔

مضامین چننے کے اس مرحلے میں وہ سب تک گئی۔ آفاق بھائی نے ڈرا دیا۔ سائنس بہت مشکل ہے سیدھا سیدھا آرٹس پڑھو۔ شازیہ' مازیہ نے بھی آرٹس کو آسان قرار دیا۔ ماموں کو دلچسپی نہیں تھی۔ بیوہ بہن کی بیٹی خود پڑھا کو تھی۔

"بیٹا! تم تو خود اتنی قابل ہو' جو کرو گی ٹھیک ہی ہوگا۔ مجھ ان پڑھ کو کیا پتا۔"

شجرہ چپ کر گئی۔ وہ دونوں مضامین کے فائدے اور مستقبل کے راستے بتا تو رہی تھی ناں۔

شجرہ کتابیں جگہ پر رکھ رہی تھی۔ اس نے یونیفارم بدلا۔ ٹھنڈے پانی سے چہرے پر چھپاکے مارے۔ محسنہ کی اس کی جانب سے لاپروائی اسے کھل رہی

تھی۔ وہ کب کہہ رہی تھی کہ وہ اسے گود میں بھر کے بیٹھ جائیں۔ وہ تو بس۔ پتا نہیں۔

☆ ☆ ☆

"نہیں تو کوئی زور زبردستی ہے۔" وہ مصنوعی جھنجلاہٹ سے کہہ رہی تھی۔ "ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت ہے جب ہی تو کہہ رہا ہوں۔" وہ مصر تھا اور پُریقین بھی۔ (وہ ہنسی روک رہی تھی۔ اچھی زبردستی ہے بھئی۔)

"قسم سے سنان۔! میں لے جاؤں گی پڑھ بھی لوں گی۔ تم کہو تو یاد بھی کرکے آجاؤں گی۔ ایک سانس میں سنادوں گی اگر غلطی نکلے ناں۔ ایک ذرا سی بھی تو۔" اس نے چٹکی بنا کر دکھائی۔ "تو جو چاہے سزا دے دینا مگر مجھے شعر سمجھ میں نہیں آتے۔" اس کا لہجہ سچائی کا مظہر تھا۔ ملتجی بھی۔ وہ ہر صورت اسے باز رکھنا چاہتی تھی۔

"تم کو ناں کورس کی ان بور کتابوں سے آگے بھی کچھ پڑھنا چاہیے۔" وہ نئے سرے سے نئے دلائل دینے لگا۔

"تو پڑھتی تو ہوں ناں۔ سارے اخبار ایک ایک لفظ۔ اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ اخبار" سنان نے بدمزہ ہو کر کھینچ کر کہا۔ "وہ بور روکھے سوکھے کالمز۔ وہ سیاست و معاشرت کے۔ عرفان صدیقی کی باتیں حسن نثار کے زہر میں بجھے تیر اور گالیاں' ہارون رشید کی پیش گوئیاں نذیر ناجی کی قلابازیاں ان کو تم پڑھنا کہتی ہو۔ مسرت جبین۔" وہ تیز لہجے میں شروع ہوا تھا۔ شجرہ نے فوراً" ٹوکا۔

"اے مسرت جبیں کو کچھ نہ کہنا۔ وہ تو اتنا شان دار لکھتی ہیں اور عطاء الحق قاسمی اور عرفان صدیقی کی تو بات ہی۔"

"او میں نے کب کہا کہ وہ اچھا نہیں لکھتے مگر تم ان سب کے علاوہ کچھ اور پڑھتیں کیوں نہیں۔" وہ شاید اپنے بال نوچنے والا تھا۔ شجرہ کو مسلسل ہی ہنسی آرہی تھی مگر ہنسنے سے وہ شاید خفا ہوجاتا۔ اس لیے سنجیدگی سے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اب ضبط نہ رہا۔ اور ہنسی کی گرفت ڈھیلی کردی۔ کِل کِل کِل۔

"یار! تم پڑھو تو جسٹ ریڈ اینڈ فیل۔" وہ مسحور کیفیت میں گھر گیا۔ اس کے ہاتھ میں نسخہ ہائے وفا تھی۔ "میں تمہیں پہلے کچھ آسان چیزیں سناتا ہوں۔"

سنان کے لیے ہر صفحہ اور ہر سطر خوب صورت اور سحرزدہ کردینے والی تھی۔ مگر اس نے شجرہ کے لیے۔

خدا وہ وقت نہ لائے۔
خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تُو۔
سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہوجائے
تیری مسرت پیہم تمام ہوجائے
تیری حیات تجھے تلخ جام ہوجائے
غموں سے۔۔۔

"کیسا؟" بہت خوب صورت لب و لہجے میں جذب کے ساتھ پڑھتا سنان کسی اور ہی جہاں سے بول رہا تھا۔ واپس لوٹا مگر جی بھر کے بدمزہ ہوا۔ دل ٹوٹ گیا۔

شجرہ نے اس کی اس کیفیت کو محسوس کیا تھا اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ اسے اس طرح شعر پڑھتے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور ایسے میں اس کے لہجے کی خوب صورتی اور آواز کا اتار چڑھاؤ دل موہ لینے والا تھا۔ اسے اس کو سننا بہت اچھا لگا تھا۔ کانوں کو بھلا اور دل میں اترتا سا مگر۔ اس کا سوال۔

"کیسا؟

"بہت اچھا۔ سنان بہت اچھا۔ تم بہت اچھا پڑھتے ہو۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔

"اوہ!" سنان نے سر پر ہاتھ مارا۔ "پڑھنے کو چھوڑو شعر کیسے ہیں؟"

"اوہ شعر اچھے ہیں۔ شعر۔ اچھے۔ اچھے بہت اچھے۔" وہ اس گہرائی میں گئی ہی کب تھی جہاں سے وہ ابھرا تھا۔ اسے تو شاید کنارہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور یہ سنان نے بھانپ لیا۔

"تم۔" وہ اپنی ہتھیلی میں مکا مار کر رہ گیا۔

"نہ ۔۔ نہیں۔ خفا مت ہو۔ اب ایسی بھی بات نہیں۔ شاعر کا انداز دعاگو ہے۔ وہ اپنے محبوب کو کسی بھی مصیبت یا مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتا اور۔ دراصل شاعر این شعر میں۔"

"بس۔ بس۔ خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔" سنان نے ششدر رہ کر سنا تھا اور پھر نجانے ضبط کی کن کن راہوں سے گزر کر بولا تھا (چلایا تھا کہ۔ ارد گرد سے گزرتے کچھ اسٹوڈنٹ چونک کر متوجہ ہوئے تھے)

سنان نے سب کے چونکنے کو محسوس کر کے اپنے ہاتھ صلح جو انداز میں پھیلائے، وہ جیسے خود کو شانت رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ سانس لے رہا تھا۔ سانس چھوڑ رہا تھا۔

مار دینے کے سو طریقے (یہ کتاب کہاں سے ملے گی؟) نہیں۔

مر جانے کے سو طریقے (اسے ڈھونڈنا ہو گا۔) بس۔

"سوری۔ سوری سنان۔" سنان کا چہرہ دلی جذبات کا ترجمان تھا۔ شجرۃ نے فوراً" کہا۔ "ایسی بات بھی نہیں۔ مجھے "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" کا پتا ہے بلکہ وہ مجھے یاد بھی ہے۔ اور اسے میں سمجھ بھی سکتی ہوں۔"

وہ اپنی صفائی میں تیز تیز بول رہی تھی۔

"یہ بھی تمہیں شاعری کے حوالے سے یاد نہیں ہو گی۔ نور جہاں کی وجہ سے۔ کہ انہوں نے اسے اتنی خوبی سے گایا ہے۔" وہ دانت پیس کر اب کتاب کو بند کر رہا تھا۔ سیاہ جلد پر چاندی رنگ کے الفاظ۔

شجرۃ کو ایک بار پھر زور سے ہنسی آئی۔ اتنی خفگی؟

"اچھا نور جہاں نے اسے گایا ہے؟ مجھے نہیں پتا؟ میں نے تو۔"

"تو پھر تمہیں کیسے یاد ہو گئی؟" وہ بیگ بند کر رہا تھا۔ ذرا سا رکا۔ شجرۃ نے ہونٹ کا کونا دانت میں دبایا۔

"سچ بتاؤں؟"

"سچ ہی۔" "اس نے تادیبا" انگلی اٹھائی۔

"وہ اردو کی ٹیکسٹ بک میں تھی ناں تو۔"

"او گاڈ۔ گڈ گاڈ۔!" وہ سر پر پیر رکھ کے بھاگنے کو تھا۔

"اچھا اندر مت رکھو۔ مجھے دو۔ قسم سے میں پڑھنے کی کوشش کروں گی۔ نہیں میرا مطلب ہے سمجھنے کی۔ نہ۔ میرا مطلب ہے۔" سنان کے چہرے کے تاثرات بگڑتے دیکھے تو اپنے جملے کی تصحیح کر دی۔

"میرا مطلب ہے انجوائے کرنے کی۔"

☼ ☼ ☼

شجرۃ نے گھر لوٹتے ہی ٹیوشن والے بچوں کو جلد از جلد نبٹانے کی کوشش کی۔ وہ ساتھ ساتھ بیٹھی اپنے ہوم ورک کے کچھ صفحات بھی کرتی جا رہی تھی۔ عام طور پر محسنہ اسے کام نہیں کہتی تھیں لیکن کھانے کے برتن اٹھانے جیسا کام بھی اسے آج ناگوار گزر رہا تھا۔ گھر میں کام کاج کے سلسلے میں کوئی لڑائی نہیں تھی۔ بڑے ماموں کی دو بیٹیوں کی جلد شادی کر دی گئی تھی۔ تیسری پڑھنے کی شائق رہی تھی۔ مگر وہ کند ذہن تھی۔ میٹرک میں ایک پیپر رہ جانے کے بعد دل ہی چھوڑ بیٹھی۔ اس سمیت دیگر اہل خانہ سب شجرۃ کی محنت، شاندار کامیابی کو جانتے تھے، مانتے تھے اور جب جب راستے میں لوگ ماموں کو روک کر سفارش، گزارش کرتے کہ اگر شجرۃ ان کے بچوں کو بھی ایک گھنٹہ دے دے تو ماموں کا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔

شہزاد کو مار مار کر پڑھانے کے بعد سے تو وہ چھوٹی مامی کی پسندیدہ ترین ہو چکی تھی۔ شہزاد کے گھونسے، تھپڑ کھا کر کسی کے پاس دادرسی کے لیے نہیں جایا جاتا کہ ہر در سے ٹھکرایا ہی جاتا۔ اب تو خیر اس نے سمجھوتا کر لیا تھا اور خود سے پڑھنے اور پوچھنے بیٹھ جاتا۔

سو اس وقت برتن دھونے کے نام پر آنے والی شکن چھوٹی مامی سے پوشیدہ نہ رہی۔ سب ہی جانتے تھے، وہ رات گئے تک پڑھتی ہے۔ ٹہل ٹہل کر کبھی اونچی آواز، کبھی مدھم۔

"رہنے دو محسنہ۔! شجرۃ سے نہ کہو، سارا دن کھپتی ہے بے چاری۔ یہ نازیہ دھولے گی۔"

اور نازیہ نے قطعاً" برا نہ مانا۔ تابع داری سے سرہلادیا۔

"ماسی! چائے کا ایک کپ میرے لیے بھی۔" شجرۃ نے بلا جھجک کہا اور اندر بڑھ گئی۔ ماسی نے سرہلادیا تھا۔ کسی کے ماتھے پر شکن نہیں تھی۔

"شہزاد! سوال یاد کیے بغیر مت سونا۔ میں سر پر پانی ڈال دوں گی۔" اس نے اونچی آواز میں کہا تھا۔ شہزاد پھنس جانے پر نظریں چرانے لگا۔ کسی نے بھی نہیں کہا۔ "اب رہنے دو' سو جانے دو۔" اسے اب سوال یاد کرنا ہی تھا۔ سب کے کانوں میں پڑ گیا تھا ناں کہ شجرۃ نے سوال یاد کرنے کو دیا ہے۔

شجرۃ نے سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد بڑی تسلی سے نسخہ ہائے وفا نکال لیا۔

وہ اپنی چارپائی پر تکیے کا سہارا لیے نیم دراز تھی۔ ٹانگوں کی قینچی بنی تھی اور گود میں کتاب دھری تھی۔ وہ ورق پلٹ رہی تھی۔

اشعار پڑھتی تھی۔ غزلیں اور نظمیں۔ کچھ لفظ سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں۔ انہیں وہ دوبارہ اور سہ بارہ پڑھتی۔ چار پانچ مرتبہ اسے اٹھ کر لغت سے معنی ڈھونڈنے پڑے۔ مگر اسے یہ کتاب پڑھنی تھی ہر صورت۔

شعروں سے ناواقفیت کے باوجود وہ کچھ چیزوں پر چونکی تھی۔ کچھ بحریں دل کو لگی تھیں' کچھ پر ورق پلٹتا ہاتھ تھما تھا۔

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے
یا شمع پگھل رہی ہے
پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے
تم ہو کہ میری جاں نکل رہی ہے

سننے کو بھیڑ ہے سر محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتش مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

وہ چونکہ کتاب میں موجود فیض کی یادداشتیں' جیل کے ایام' کچھ دوستوں کے خیال بھی ساتھ ساتھ پڑھ رہی تھی تو پہلی بار سب کچھ جان رہی تھی بعض چیزیں اسے اس تناظر میں بھی سمجھ میں آنے لگیں۔

اپنے انعام حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

ایک بار پوری کتاب ختم کرلینے پر اس نے پایا کہ اسے کتاب میں موجود شاعری سے زیادہ نثر نے متاثر کیا تھا۔ اس نے نثر کو دوبارہ پڑھنے کے لیے خود کو مجبور پایا تھا۔

رات کی آنکھ میں کاجل تھا اور دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہر سو سیاہی کی چادر تن گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے اسے ایک رات میں پڑھ لیا؟" وہ یہ جملہ چیخ کر لینا چاہتا تھا۔ مگر صدماتی حیرت نے گویا آواز کا گلا گھونٹنا شروع کردیا تھا۔

"ہاں!" وہ طمانیت سے چیونگم کا ریپر کھولتے ہوئے بولی۔ "دو مرتبہ۔"

"ک۔ کیا؟" اس کے حلق سے سیٹی سی آواز نکلی۔ "دو مرتبہ؟"

شجرۃ نے منہ میں چیونگم رکھ لی تھی۔ سر زور زور سے ہلا کر اثبات کہا۔ پھر یکدم اسے سنان کے چہرے کے بے یقین شدید صدمے میں گھرے چٹخے چہرے کا دھیان آیا۔

"کیا اور زیادہ پڑھنی تھی۔؟"

"بے وقوف لڑکی!" وہ مقدور بھر ضبط کے باوجود چلایا۔ "فیض کے ایک مصرعے پر گیارہ راتوں تک غور کیا جاسکتا ہے کہ گہرائی سے ابھر نہیں پاتے گیارہ راتوں کے گیارہ سو معنی اور کیفیتیں۔ اور تم نے ایک۔ رات میں۔ پورا آآ آ۔ دیوان پڑھ لیا۔"

"وہ بھی دو مرتبہ" اس کی خاموشی پر شجرۃ نے ٹکڑا لگایا۔ یاددہانی۔

"ارے میرے اللہ!" وہ سرہاتھوں پر گرا کے بیٹھ گیا تھا۔

"اتنی ڈھیر ساری چیزیں تو مجھے زبانی بھی یاد ہوگئیں۔" وہ اب ذرا گھبرائی۔ "سناؤں؟"

"بھاڑ میں جاؤ۔ دو ادھر میری کتاب۔" اس نے جھپٹا مارا۔

شجرۃ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کلاس کی بیل ہوگئی۔ دونوں بھاگے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ شجرۃ کا دھیان کئی بار لیکچر سے بھٹکا اور نگاہیں ٹیچر سے ہٹ کر سنان الیاس پر گئیں جس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ مگر چہرے پر خفگی سی تھی۔ شجرۃ نے سوچا شاید اس نے کچھ غلط کہہ دیا ہو' وہ سوری کرلے گی۔ مگر چھٹی میں موقع نہیں ملا۔ وہ کچھ لڑکوں کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔

انسٹیٹیوٹ سے پہلے اسٹاپ کی بس میں ڈنڈا پکڑ کر کھڑی وہ سنان ہی کو سوچ رہی تھی پھر اسٹاپ سے گھر تک تین راڈ اور نو گلیاں۔ آج ٹھوکروں پر چلتا ہمسفر پتھر کئی بار ادھر ادھر لڑھکا۔ وہ عجب غائب دماغی سی کیفیت میں تھی۔ رات بستر میں جانے تک۔

اور آج کی رات کی آنکھوں میں پچھلی رات سے بڑھ کر کاجل کی لکیریں تھیں جو پھیل کر ہر سو حاوی ہو رہی تھیں۔ سیاہی حد سے سوا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دے۔ اوپر سے سردی۔ رات کپکپا رہی تھی۔ صبح کے سورج کو سوچ رہی تھی۔ وہ بھی بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ پلکیں ایک دوسرے سے ہم آغوش تو ہوئی تھیں۔ مگر یہ وقتی قربت تھی' کبھی جڑتیں کبھی ٹوٹتیں۔ ایک دوسرے سے مدغم ہو کر سکون نہیں پا رہی تھیں۔ شجرۃ کو بھی صبح کے سورج کا بے چینی سے انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

شجرۃ نے سوچا وہ سنان سے سوری کہے گی۔ شاید وہ ہرٹ ہوا تھا یا کچھ بھی۔ آج کالج آف تھا اور وہ گھر سے انسٹی ٹیوٹ کی جانب آئی تھی۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ سول ڈریس میں ہو۔ سبز رنگ کے کاٹن کے پرنٹڈ سوٹ میں بالکل نئی نئی لگ رہی تھی۔ آج بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے جمے ہوئے۔ جب کالج سے آتی تھی تو وقت سے پہلے موجود ہوتی تھی۔ مگر آج ٹائم کا اندازہ نہ لگایائی پھر بس بھی دیر سے ملی' سو وہ حد سے زیادہ لیٹ ہوچکی تھی۔ ہانپتے بھاگتے اندر پہنچی تو کلاس خالی تھی۔ اس نے اچنبھے سے گردو پیش کو دیکھا۔ سامنے سے ماسی آرہی تھی۔

"سر کے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے۔ بہت سوں کو تو فون کردیا گیا تھا۔ تمہیں نہیں پتا لگا۔"

"اوہ۔" وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔ اس کے گھر فون نہیں تھا۔ وہ باہر نکلی باقی پریڈز ہو رہے تھے۔ بیرونی ہال میں آکر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ ہال کی بیرونی دیوار شیشے کی تھی۔

اسے دور سے سنان الیاس آتا دکھائی دیا اس کے قدموں میں بہت تیزی تھی اسے بھی نہیں پتا تھا کہ کلاس آف ہے۔ دیوار کے دونوں جانب وہ دونوں تیزی سے بڑھے۔ کلاس ڈور اندر اور باہر کھلتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آن رکے۔ دونوں دروازے کو دھکیلنے لگے۔ شجرۃ نے اپنا ایک ہاتھ ہینڈل پر رکھا تھا۔ کہ کھولے تو وہی۔ دوسری جانب سنان کی بھی یہی کوشش تھی۔ وہ ہینڈل پکڑ کر زور لگا رہا تھا۔

سنان نے سوچا اگر وہ ذرا سا ٹھیک دباؤ ڈال دے تو دروازہ جھٹکے سے کھل جائے گا۔ اس صورت میں شجرۃ پیٹھ کے بل بہت زور سے دور جا گرے گی۔

وہ یکدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیت شجرۃ کی ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ روشن ہوگیا جگمگانے لگا۔ وہ جو مسکراتی بھی بہت کم تھی۔ پچھلے کچھ دن سے تھوڑا تھوڑا ہنسنے لگی تھی۔ مگر اب کی بار ہال کمرے کے سناٹے میں گونجنے والی اس کی ہنسی خود اس کے لیے حیرانی تھی۔ اسے پہلی بار پتا لگا۔ دل کھول کر ہنسنے سے دل کتنا خوش ہوتا ہے اور پھیپھڑے کتنے تازگی محسوس کرتے ہیں۔ کیسی

تازہ ہوا... تازگی اندر تک بھر جاتی ہے۔
وہ اپنی کتابیں اور بیگ پیٹ سے لگائے ہنستے ہوئے باہر نکلی تھی۔
سنان ہنسا نہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے جیت کا جشن مناتے دیکھ رہا تھا۔
اسے بھی پہلی بار پتا لگا۔ وہ ہنستے ہوئے کتنی نئی نئی اور خوبصورت و دلفریب لگتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سوری! میں نے شاید تمہیں ہرٹ کیا۔" شجرۃ نے کہا تھا۔
"تو۔ تو سوری شاید میں نے زبردستی تمہیں مائل کرنے کی کوشش کی۔ ہر شخص کی سوچ ہوتی ہے دلچسپی۔ جیسے دنیا میں ہر انسان شاعری نہیں کر سکتا۔ ویسے ہی ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ سوری تو مجھے کرنا چاہیے۔" سنان بھی سوری ہی سوچ کر آیا تھا۔
"نہیں۔ سوری مت کہو۔ میں واقعی شاعری کو سمجھنا چاہوں گی۔"
"شاعری سمجھنے کی چیز نہیں ہے بے وقوف!" وہ اس کی کم علمی پر اب خفا نہیں تھا۔
"او کے۔ میں جاننے کی کوشش کروں گی۔"
"شاعری کوشش کا نام ہی نہیں ہے۔ یہ تو ابہام ہے۔ کیفیت ہے۔ گمان اور پہچان ہے۔"
"پتا نہیں۔ مگر میری ایک عادت ہے سنان۔ اچھی یا بری۔ پتا نہیں۔ میں ہار نہیں مانتی۔ کسی چیز کے پیچھے پڑ جاؤں ناں تو بس۔ اب اتنی بھی کوڑھ مغز نہیں۔ میں واقعی تمہیں کر کے دکھاؤں گی۔" اس نے اپنی فطری خوبی یا خامی بتائی اور ساتھ دعوا بھی کر دیا۔
"لاؤ۔ مجھے وہ کتاب دو۔"
"وہ تو میں گھر چھوڑ آیا۔"
"اوہ۔"
"ہاں۔ لیکن یہ۔" وہ اپنے بیگ میں ہاتھ مارنے لگا۔ ہاتھ باہر آیا تو وہ "چاند نگر" تھی۔ "میں نے شاید پہلے تمہیں کچھ مشکل چیز دی تھی۔ آسان تو خیر یہ بھی نہیں مگر یہ دل کو قریب سے چھونے والی شاعری ہے۔ بہت گہری بہت سادہ۔" شجرۃ نے جملے شاید سنے بھی نہیں۔ اس نے یونہی کتاب کھول لی۔

ہم دل کو لیے پردیس پھرے۔ اس جنس کے گاہک مل نہ سکے
اے بنجارو! ہم لوگ چلے۔ ہم کو تو خسارہ ہوتا ہے

ہم کسی در پہ ٹھہرے نہ کہیں دستک دی
سینکڑوں در تھے میری جان تیرے در سے پہلے

ہم کسی سمت بھی نکلے ہوں وہیں جا نکلیں
ہم سے بھولی ہے وہ کوچہ جاناں کوئی

بھیگی شاموں میں کھلے صحن میں تنہا تنہا
بے قرار! نہ ہی دیکھا ہے خراماں کوئی

اور رات کے اس پہر وہ سیڑھیوں پر تنہا بیٹھی تھی۔ چاند نگر کے اوراق پھڑپھڑا رہے تھے۔ اسے شعر سمجھ میں آتے نہ ہوں، یاد ضرور ہو جاتے تھے گھٹنوں پر سر رکھ کے آنکھیں موندے وہ نیند سے بے حال ہو رہی تھی۔ دروازے کو کھولنے کی کشمکش کا وہ منظر بار بار دھیان کے دریچے پر دستک دیتا تھا۔
چہرے پر مسکان آتی پھر حیرت۔ پھر ہنسی۔ اس نے کبھی ایسے کھیل نہیں کھیلے تھے۔
رات بستر میں نیند اچھی نہیں آئی۔ مگر وہ ایک عجیب سا گڈمڈ خواب بار بار دیکھتی تھی۔ وہ دونوں اطراف کا زور۔ شرارت۔ کوشش۔ نتیجہ۔
اس کی بے تحاشا ہنسی پر مقابل کی مسکراہٹ۔ وہ جیسے اتنے بڑے دل کا تھا کہ اس کی جیت کو بھی منا رہا تھا۔
سب سے عجیب بات یہ تھی۔ خواب کی منظر نگاری میں وہ شیشے کی دیوار کہیں نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز شجرۃ الدر چور نظروں سے سنان الیاس کو دیکھتی رہی۔ وہ سر کے لیکچر کو شعوری کوشش سے سنتی تھی کہ دھیان پلٹ جاتا تھا۔
سر کی والدہ کل شدید بیمار تھیں۔ سر پریشانی میں گھرے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک لیکچر نہ دے پائے۔ کتاب بند کر کے کرسی پر براجمان ہو گئے۔ وہ اسٹوڈنٹ سے ان کے فیوچر پلان کے بارے میں پوچھنے لگے۔ ہاتھ سے اشارہ کرتے جاتے اور اپنی باری آنے پر سب اپنے دل کی کہتے۔ سر خاموش تھے۔ ہاں کسی سے کوئی سوال کر لیتے۔
ایک سے ایک حیران کن جوابات۔ ہر شخص کے لیے پڑھائی اس لیے اہم تھی کہ وہ اسے پروفیشن کے طور پر آگے کام لا سکے۔ جتنی اچھی پڑھائی، اتنی اچھی کمائی کا فارمولا۔ ایک نے تو حد کر دی۔ انگلش لینگویج میں اس لیے انٹرسٹڈ ہے کہ شادی ہو کر امریکہ جانا ہے سو ابتدائی تعلیم تو حاصل کر کے ہی جائے۔
کلاس کبھی حیرت میں مبتلا ہوتی تھی۔ کبھی رشک میں اور حسد میں۔ ہنس بھی پڑتی تھی۔ سنان الیاس کے جواب نے سب کو حیرت، رشک و حسد میں مبتلا کر دیا۔
"سر! میرے لیے پڑھائی ایک اچھے پروفیشن کو حاصل کرنے کی سیڑھی نہیں ہے۔ میرا ایک فیملی بزنس ہے۔ جسے بھائی چلاتے ہیں اور مرحوم والد میرا شیئر رکھ گئے ہیں مگر میں کوئی بھی چیز اس لیے پڑھتا ہوں کہ مجھے پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ میرے نزدیک تعلیم خوب صورتی ہے۔ اسے اپنا کر آپ اپنے اندر جو دل فریب خوبصورتی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کی کسی بھی بیوٹی پروڈکٹ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔"
سر بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ وہ تالی بجا رہے تھے۔
شجرۃ سمیت سب کے سب گنگ ہو گئے جیسے۔ سنان کلاس میں کبھی بہت نہیں بولا تھا۔ مگر آج کے چند جملے اس کی پوری شخصیت اور سوچ کو عیاں کر گئے۔
دوسری جانب شجرۃ الدر کے جواب نے سب کو حیران بھی کیا اور کئی جیسے احمقانہ بات پر ہنسے بھی۔
"سر! میں بی اے بی ایڈ کر کے اسکول ٹیچر بننا چاہتی ہوں۔"
"ہائیں!" ساری کلاس حیران ہو گئی۔ اپنی ذہانت پلس محنت وہ کلاس کو دکھا چکی تھی۔ اس کے سارے کام مکمل ہوتے تھے اور ایک بار کی سمجھائی بات اس نے کبھی دوبارہ نہ پوچھی تھی اور جواب اتنا سادہ اور دو ٹوک۔ حیرت۔ ہنسی اور شریر سا "اوہ۔"
"ٹیچر!" سر نے پوچھا۔
"یس سر۔ بس۔" وہ بولی۔
"گریٹ۔" سر نے سراہا۔ وہ کچھ کہنے والے تھے۔
"سر! دراصل لیڈی ٹیچر ہونے کی صورت میں ساٹھ سال کی عمر تک مس پکارا جاتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا آپ اتنی ایج کانشس ہیں۔" یہ کسی کی شریر جملہ بازی تھی۔
شجرۃ نے مڑ کر کہنے والے کو دیکھا۔
"دراصل سر! میرے فادر۔ میرے مرحوم فادر اسکول ٹیچر تھے۔ میں بس ان جیسا بننا چاہتی ہوں۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر تھے۔ اور بہترین استاد تھے اسپیشلی میتھ سر۔"
سر کے چہرے پر ستائش پھیل گئی۔ وہ بتانے لگے کہ استاد ہونا کتنی بڑی عنایت ہے۔ یہ پیغمبروں کا شعبہ رہا ہے۔
شجرۃ کے چہرے پر تفاخر آمیز مسکراہٹ بڑھتی چلی گئی۔ اسے لگ رہا تھا۔ سر اس کے فادر کی صفات بیان کر رہے ہیں لیکن۔
"مجھے نہیں پتا تھا، تم اتنی بڑی کنویں کی مینڈک ہو۔ اور دور کی نگاہ اتنی کمزور ہے؟" سنان نے چھوٹتے ہی اسے لتاڑا تو وہ بری طرح چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
"تم بھی ان باقیوں کی طرح ٹیچنگ کو انسلٹنگ پروفیشن سمجھتے ہو۔" وہ ششدر رہ گئی تھی۔
"ہاہ۔" سنان نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ گھسائے ہوئے استہزائیہ انداز میں گردن پیچھے ڈھلکائی۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔ شجرۃ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے بہت

برا لگا۔ وہ اس کی توہین کر رہا تھا۔ اور اس کے خیال کی ،اور اس کے والد کی بھی۔ ہاں۔ اس کی فطری درشتی عود کر آئی۔

"سر کے آگے بڑی حسین جملے بازی کر کے آئے ہو۔ خود انٹر سے آگے پڑھ کر نہ دیے۔ ہاں یا پھر شاعری کو تعلیم کہتے ہوں گے۔ انٹر کا نام بھی خود ہی لے لیا ہے۔ ہمیں کیا پتا پاس ہوئے کہ فیل۔ باتوں کے بادشاہ ہو۔ جملوں کا خزانہ ہے۔ دونوں ہاتھوں سے صبح و شام لٹاتے ہو۔ دنیا دریا دلی کی تعریف نہ کرے تو کیا کرے۔"

وہ غصے سے سرخ ہو گئی تھی۔ ادھار رکھنے کی وہ فطرتا" قائل نہیں تھی۔ اسے لگا' سنان نے اس کے ابا کی بے عزتی کی ہے۔ وہ اس کے اپنی ذات پر بہت سے احسان مانتی تھی۔ مگر ابو کے لیے۔ ہاں وہ تھی احسان فراموش۔

اس کے بھبھو کا چہرے اور سخت تلخ لہجے پر وہ برا نہیں مانا۔ مربیانہ انداز میں مسکرایا اور مسکراتا ہی چلا گیا۔ شجرہ الدر کو اور زیادہ برا لگا۔

"تم تو بہت غصے والی ہو بھئی۔ دن میں تارے دکھا سکتی ہو اور آئینہ دکھا سکتی ہو اور۔ میرے پاس جملوں کا خزانہ ہے تو تمہارے پاس جملوں کا اسلحہ خانہ۔ منٹوں میں اگلے کے پرخچے اڑا سکتی ہو۔ نیست و نابود کر سکتی ہو۔" وہ خفا نہیں ہوا تھا۔ جھوم گیا تھا۔ جیسے خیام کی رباعی سن لی ہو۔

شجرہ کا چہرہ ہنوز پتھر تھا۔ وہ شاید آستین چڑھا کر لڑنا چاہتی تھی۔ اس کی خاموشی بھی کھل رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے تاکہ وہ اسے تاک تاک کر جواب دے سکے۔ اور وہ چہرے کی تحریر کا حرف حرف پڑھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا۔

"میٹرک میں شروع کے بیس اسٹوڈنٹ میں میرا نام تھا۔ اور انٹر میں اے ون گریڈ۔ آنرز کے لیے یونیورسٹی میں ایڈمیشن بھی ہو گیا تھا۔ مگر شدید خطرناک ایکسیڈنٹ کے باعث تقریبا" ایک سال بیڈ پر رہا۔ اب نیو ایڈمیشنز میں جاؤں گا۔"

وہ زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ بہت سرسری سا بتا رہا تھا۔ شجرہ کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔ وہ بے یقین تھی۔ کیا پتا سچ کہہ رہا تھا کہ جھوٹ۔ وہ اس کے بارے میں جانتی ہی کیا تھا۔ سنان چہرہ شناسی کے فن میں ماہر تھا یا شجرہ ہی کو پڑھ پاتا تھا۔ وہ یکدم بیک پر لگا بیگ اتارنے لگا۔ پھر نیچے جھک کر اپنی جینز کے پائنچے مقدور بھر موڑنے کی کوشش کی۔

"یہ ادھر دیکھو۔" اسے پکار کر پھر وہ خود ہی اس طرح آگے آگیا کہ شجرہ کی نظر پڑ جائے اور شجرہ۔ سن رہ گئی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

دونوں پنڈلیوں کا رنگ باقی جلد کی نسبت زیادہ سیاہ تھا۔ ہڈی میں ہلکا سا خم محسوس ہو رہا تھا۔ اور ٹانکوں کے نشان یوں نمایاں تھے۔ جیسے ابھی ابھی لگائے ہوں۔

"تیز رفتار ڈرائیور اپنے حساب سے میری ٹانگیں کچلتا ہوا ہی گزرا تھا۔ یہ تو شاید میری ماں کی دعائیں تھیں کہ میں زندہ بچ گیا اور معذوری سے بھی بچ گیا۔ وہ بہت ٹھنڈے بے تاثر لہجے میں بتا رہا تھا۔

شجرہ کا ہاتھ ہونٹ پر جا رکا۔ وہ غیر ارادی طور پر نزدیک چلی آئی۔ اس کا چہرہ شرمندگی کے احساس سے چٹخنے لگا تھا۔ سنان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہ ہوئی۔ وہ پائنچے نیچے کر رہا تھا۔ شجرہ غیر ارادی طور پر ذرا سا پیچھے سرکی۔

"ہاں۔ یہ نشان رہ گئے ہیں جو وقت کے ساتھ یقینا" مندمل ہو جائیں گے اور۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

"اور جہاں تک نقص رہ جانے کی بات ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ معمولی سا لنگ زندگی بھر کی معذوری سے بڑھ کر تو نہیں۔ زندگی سے بڑھ کر تو نہیں۔"

صرف اس کا چہرہ اور آنکھیں متبسم نہیں تھیں۔ اس کا لہجہ بھی تبسم سے بھرپور تھا۔ اور شجو جیسے کسی نے پشت سے وار کر کے بھالا اس کے دل میں اتارا تھا۔ اسے بھل بھل کرتا خون دکھائی نہ دیتا تھا' وہ صرف بھالے کی خون آلود نوک دیکھتی تھی' جو چہرے کے عین سامنے دل کے مقام سے نکل کر کھڑی تھی۔

"لنگ کون سا۔ لنگ۔ کس کے۔ کب۔ کہاں؟" وہ ابلتے ڈیلوں کے ساتھ آگے ہو کر اس کی ٹانگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تو کوئی لنگ نظر نہ آ رہا تھا۔ کہاں۔

"تم تو یوں ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے تمہیں خبر نہیں۔" وہ ایک بار پھر بیگ پشت پر کسنے لگا تھا۔

"مجھے خبر نہیں تھی۔" اس کے جملے میں ٹوٹ پھوٹ تھی۔ آواز جیسے قبر کی اتھاہ گہرائی سے ابھری ہو۔

"مذاق کر رہی ہو ناں؟" وہ جو لاپروائی سے باہر نکل رہا تھا۔ آنکھیں چندھی کر کے اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں۔ نہیں۔ قسم سے۔" وہ اس کے قریب کسک آئی۔

خوف اور حیرت میں اب شرم ساری کا عنصر غالب آگیا تھا۔ اور آنکھ سے بہنے لگا تھا۔

"یہی۔ یہی تو۔ تم خود میں اتنی مگن رہتی ہو یا پھر کہاں رہتی ہو شجرہ۔ تمہیں سامنے پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ تم لاپرواہ ہو۔ یہ تو میں نے مان لیا تھا۔ اندھی ہو۔ یہ مجھے بھی نہیں پتا تھا۔ اب بھی سچ کہہ رہی ہو یا میرا مذاق اڑا رہی ہو؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"میں سچ۔" اس نے اپنے ہونٹ کچلے۔ وہ جملہ خود ہی ادھورا چھوڑ کر ڈیسک پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

اتنے عرصے کے ساتھ میں۔ ساتھ ساتھ چل کر بھی وہ چیز نہ دیکھ سکی تھی۔ جو اس کے فقط تین قدم آگے بڑھانے پر اس نے اب دیکھی تھی۔

بہت معمولی سی۔ بے حد غیر معمولی سی لڑکھڑاہٹ۔ جیسے۔ جیسے۔ اسے کوئی تشبیہہ نہ سوجھی۔ اس لڑکھڑاہٹ کا نام نہ تھا۔ مگر وہ تھی۔

"یہی تو تمہارا فالٹ ہے شجرۃ الدر!" اس نے اس کا نام صحیح تلفظ سے ادا کیا۔

"تم اپنی سوچوں میں۔ اپنے آپ میں شاید اتنی محو رہتی ہو کہ ارد گرد دیکھتیں ہی نہیں۔ جو سوچ چکی ہو۔ کہہ چکی ہو۔ اب کاربند ہی رہو گی۔ اور تم ہی ٹھیک ہو اور تمہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ جبکہ۔" اس نے قصدا" جملے روک دیے حالانکہ وہ بہت سارے تھے۔

"میں ہمیشہ اپنے فیصلے خود کرتی رہی ہوں آج تک تو غلط نہ نکلے۔" اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ یہ خود کلامی تھی۔

"بی اے بی ایڈ میں کوئی برائی نہیں۔ قطعا"۔ نو نیور۔" وہ دائیں بائیں سر ہلا رہا تھا۔ "اسکول ٹیچر ہونے سے زیادہ اہم بنیاد کوئی نہیں۔ مگر۔ شجرۃ الدر۔ ایم اے ایم ایڈ کیوں نہیں۔ پی ایچ ڈی کے بعد ڈاکٹر کیوں نہیں۔ آب حیات کا ایک گھونٹ ہی کیوں۔ ذہانت و محنت کا ہنر خداداد ہے تم سیرابی کیوں نہیں حاصل کرتیں۔"

یہ سنان الیاس کا نیا روپ تھا۔ بیگ کو پشت پر لادے۔ بغلوں میں فیتوں کو سیٹ کرتا شعر پڑھتا ایک عام سا' بے فکرا نظر آتا نوجوان۔

وہ منہ اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ سن تو چکی ہی تھی۔ وہ اسے اشارہ کر رہا تھا۔ دیر ہو رہی ہے۔ بیگ اٹھائے اور چلے اور ہاں نکلنے سے پہلے ذرا اپنی آنکھیں پونچھ لے جو دھل رہی تھیں جن میں سرخیاں تھیں۔ کالی سیاہ گہری آنکھیں غم میں پڑ کے وہ اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ کوئی ڈوبے تو ہاتھ پاؤں چلانے کی مہلت بھی نہ ملے۔

سنان الیاس کو اپنے دل کی دیوار کی کمزوری بخوبی محسوس ہوئی۔ اس بہاؤ کا مقابلہ کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس نے نگاہیں چرائی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"محبت ابر کی صورت۔"
دلوں کی سرزمین پر گھر کے آتی اور برستی ہے۔ چمن کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے۔ مسکراتا ہے۔
ازل سے بے نمو مٹی میں سبزہ سر اٹھاتا ہے۔ محبت ان کو آباد اور شاداب کرتی ہے۔
جو دل ہیں قبر کی صورت۔ محبت ابر کی صورت۔

اسے پانچ برس کی عمر ہی میں دھتکارا نہیں گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا۔ پنگھوڑے

میں حلق پھاڑ پھاڑ کر روتا تھا۔ اور سب اس کے نزدیک آنے سے کتراتے تھے۔ یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ چپ رہے اور بالکل آواز نہ نکالے۔

آواز! نہ تکلیف کی۔ نہ آسودگی کی۔ بس پتا ہی نہ چلے کہ وہ ہے اور وہ اتنا ہی بڑا روندو تھا۔ خوشی میں بھی روتا، دکھ میں بھی روتا۔ اس کی ماں نے اسے اپنا دودھ نہیں دیا تھا کہ کہیں وہ عادی نہ ہو جائے۔ وہ ڈبے کا دودھ پیتا تھا مگر وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے فیڈر ہاتھ میں پکڑایا نہیں جاسکتا تھا۔ گود میں لے کر سینے سے لگا کر پچکارتے ہوئے بہلایا جاتا تھا۔

سب اس کے قریب آنا بھی چاہتے اور دور رہنا بھی۔ اور تو اور جنم دینے والی ماں بھی اسے حیرت سے دیکھتی تھی اس کے پورے وجود کو ناک، ہونٹ، سر، آنکھیں۔ یہ کہاں سے آگیا تھا۔ ایسے کیسے؟ ایسا بھی ہوتا ہے ہو سکتا ہے مگر ہوا کیسے؟

وہ کبھی کسی گم صم کیفیت میں اس تک آ بھی جاتی تو چند لمحوں کے ٹھہراؤ کے بعد وہاں سے بھاگ آتی جیسے بھوت دیکھ آئی ہو۔ چھپ جاتی یا کم از کم چھپ جانے کی خواہش کرتی۔

مگر چھپ جانے سے خطائیں کب چھپتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اسے بھرے جہان میں ایک آدم نظر نہ آتا۔ کون دعوے دار ہو سکتا ہے کہ اس نے کبھی کسی مقام پر لغزش نہ کھائی؟

"میں گلا گھونٹ کر ماردوں گا اس کو۔ اس کی آواز بند کروادو۔ مجھے نہ نظر آئے اس کی صورت۔"

اس حکم پر عمل درآمد مشکل تھا۔ صورت تو چھپائی جاسکتی تھی چھپالی جاتی مگر آواز۔

"ہم اسے رکھ لیتے ہیں ناں۔" اتنی نفرت کا اظہار کرنے والے کی بیوی نے فرمائش کردی۔

"ہم!" وہ چلایا "دماغ خراب ہے ہمارا کیا....."

"نہیں وہ۔ ہمارے ہاں جب اپنی اولاد نہیں ہو سکتی۔ میرا مطلب ہے نہیں ہے تو۔ گھر میں کھلونا سا ہو جائے گا۔ ورنہ کون کسی کو اپنی اولاد دیتا ہے۔ یہ تو پھر اپنا خون۔"

"اپنا نہیں گندا خون۔" وہ بھڑکا۔ میں ایسے ناجائز بچے کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا، کجا کہ اسے اپنالوں۔ آخ تھو۔"

"گندا تو نہ کہیں۔ اور ناجائز کیوں؟ وہ تو۔"

"گندا ہی ہے اور ناجائز تو بالکل ہے۔ میں کسی مثال کو نہیں مانوں گا۔ اور تم اپنے دماغ سے اس خناس کو نکال دو کہ۔"

"صرف میں کیوں سب۔ سب یہی چاہتے ہیں، سب ہی کہہ رہے ہیں۔ کہ ہمیں اللہ کی طرف سے موقع مل رہا ہے تو۔ باہر سے کسی اور سے بچہ مانگیں گے تو کیا گارنٹی ہے کہ وہ۔" اس نے جملے قصداً روکے "جبکہ یہ تو۔"

"نہ یہ نہ وہ۔ جلد از جلد اس ماں بچے کو کہو کہ اپنا بندوبست کرلیں۔ میں نہیں سن سکتا۔ بے غیرتی کے طعنے۔ مجھے تو سکون ہی تب ملے گا جب میں دنیا کو بتادوں کہ میں نے کیسے ان دونوں کو گھر سے نکال دیا ہے۔"

"دنیا تو باتیں کرتی ہے۔ جو مرضی آئے بکواس۔ دنیا حقیقت سے بھی تو واقف ہے ناں۔"

اس کے پاس ویسے ہی قائل کرنے کو دلیلیں کم تھیں اور پھر جب سننے والا جھڑک دے اور آگ بگولا ہو جائے تو۔ وہ تو کچھ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

وہ چھپ چھپ کر اس کی غیر موجودگی میں اس سے لاڈ کرتی، چوم لیتی اور جو وہ دیکھ لیتا تو نوچ کر اس سے الگ کر دیتا اور جا کر اسے اس کی ماں کی گود میں پٹخ دیتا جو حیرت سے بس چہرہ دیکھتی۔ بچے کو ہاتھ نہ لگاتی وہ اسے یوں تکتی تھی جیسے عجوبہ ہو۔

وہ اسے دھتکارتی نہیں تھی، مگر اپناتی بھی نہیں تھی، وہ تو۔



شناختی کارڈ بنوانے سے لے کر بینک سے آفرز کے لیے فارم منگوانے سے لے کر سب مِٹ کروانے تک کے سارے کاموں میں سنان الیاس پیش پیش تھا بلکہ مضامین کے چناؤ میں بھی انٹر کے ایگزامز کے بعد کے

تقریباً" چھ ماہ اس نے گلی کے علاوہ آگے پیچھے کے بچوں کو بھی ٹیوشنز دے دے کر سارے اخراجات اکٹھے کرلیے تھے۔

خاص طور پر جب سے اس نے انگلش سیکھی تھی۔ ماں باپ تو منتیں کرتے ہی ہیں۔ ایٹتھ ناینتھ کی لڑکیاں نجانے کہاں سے پوچھ پوچھ کر گھر تک آجاتیں جو بسوں میں جاکر دور دور سے کوچنگ نہیں لے پاتی تھیں۔

شروع میں مامیاں یا محسنہ ہمراہ بیٹھ جاتیں فیس وغیرہ کا مرحلہ طے کرنے کے لیے مگر شجرة نے سختی سے منع کردیا۔ وہ آنے والیوں کی احسان مند دکھائی دیتی تھیں اور فیس کم کرنے کی درخواست میں اسے چنکیاں کاٹ کر قائل کرتیں کہ وہ مان جائے جبکہ شجرة قصائی بنی ہوتی اسے علم تھا کہ آگے اس کی پڑھائی کس قدر مہنگی ہونے والی ہے۔

"آپ سب لوگ برائے مہربانی مجھے مشورے دینے مت آئیں بلکہ میرے پاس آکر بھی نہ بیٹھیں اور اتنا شکر گزار کیوں ہوتی ہیں۔ شکر گزار ہمیں نہیں انہیں ہونا ہے۔"

وہ فیس کے معاملے میں قطعی تھی اور فیس کی تاریخ پر مزید جلاد۔ دس تاریخ آندھی یا طوفان۔۔۔

فیس طے کرتے ہوئے جب قطعیت سے انکار کرتے ہوئے انگلش میں کچھ جملے کہہ دیتی تو سب کو کوئی فنانس منسٹر، بینکر نظر آتی۔ علم نے اسے عزت اور دولت بخشی تھی۔

اپنے تمام فیصلوں میں وہ اب اتنی بااختیار تھی جیسے کسی بڑے قبیلے کا سردار یا پنچائیت کا سردار۔

میں جارہی ہوں۔ آرہی ہوں۔ اب تو دیر سویر کا بتانا چھوڑ چکی تھی اور سب نے پوچھنا ہی چھوڑ رکھا تھا ایسے میں جب محسنہ نے پوچھا۔

"بی اے کے لیے نیا یونی فارم سلوانا ہے۔"

"یونی فارم کی اب مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"نہیں۔۔۔؟" محسنہ کے سان و گمان میں بھی یہ جواب نہ تھا۔

"میں آنرز کرنے کے لیے یونی ورسٹی جارہی ہوں' امی! اور وہاں یونی فارم نہیں ہوتا۔"

"یو۔۔۔ن۔۔۔ی۔۔۔و۔۔۔ر۔۔۔ٹی۔۔۔" محسنہ نے یونی ورسٹی کے ٹکڑے کردیے۔

"وہاں کیا۔۔۔ کیا کرنے جانا ہے؟"

"آنرز۔۔۔ آنرز ایک ڈگری کا نام ہے۔" وہ آسان الفاظ جمع کرنے لگی۔

شام تک سارے گھر کو یونی ورسٹی اور آنرز کے معنی و مقاصد اور فوائد ازبر ہوچکے تھے۔ رشک آمیز حیرت۔۔۔ فخر۔۔۔ یعنی کہ یونی ورسٹی۔۔۔

✲ ✲ ✲

بڑے ماموں اور محسنہ نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرکے حیران کردیا۔ ٹھیک ہے' وہ ضرور ایڈمیشن لے مگر وہ دونوں اس کے ہمراہ جاکر ایک بار یونی ورسٹی کو دیکھ تو آئیں اور وہ شانے اچکا کر رہ گئی۔ "کیا جاکر دیکھنا؟" مگر ماموں اور امی دیکھنے آئے تھے اور دیکھ دیکھ کر تھکتے نہیں تھے۔

امی نے اپنا نیا سوٹ زیب تن کیا اور ماموں نے چلتے چلتے واسکٹ بھی چڑھالی تھی۔ ناینتھ کلاس سے بھاگے ماموں اور گھر گرہستی میں جتی امی کے لیے یہ ایک نئی دنیا تھی ایک نیا جہان۔

امی کا سر ایک انجانے فخر سے بلند تھا۔

ماموں کو اپنے اندر ایک جوانی محسوس ہورہی تھی۔ وہ اپنی عمر کو آنرز کے لیے آئے ان اسٹوڈنٹ کے برابر ہی محسوس کررہے تھے اور اکڑ کر گھومتے ہوئے اس جم غفیر میں خود کو پی ایچ ڈی ڈاکٹر محسوس کررہے تھے یا پھر ایک پروفیسر۔

وہ بار بار شجرة کے نزدیک ہوجاتے اور اس کے ڈاکومنٹس کی فائل تو مستقل پکڑ رکھی تھی۔ یہاں ہر طرح کے لڑکے لڑکیاں' والدین موجود تھے جن میں شجرة بھی تھی۔ وہ سادہ لباس' سادہ چہرے کے ساتھ تھی اور سب سے اہم خوبی بااعتمادی اور ایک بے نیازی سی تھی۔ اس پر جیسے گردوپیش کا اثر تھا ہی نہیں۔ وہ ایڈمیشن کے حوالے سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف بھاگتی۔ لائن میں لگتی۔

یہیں ماموں اور امی پہلی بار سنان الیاس سے ملے جو بے نیازی' بااعتمادی و بے فکری میں سب سے آگے تھا۔ وہ گرم جوشی سے ملا۔ ذرا سا خمیدہ۔ اس نے ان دونوں کو بے حد عزت دی۔

شجرة نے اپنا بیگ اور کچھ فائلز محسنہ کو پکڑا رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔ وہ ہر بار جب بھاگ کر آتی بوتل منہ سے اونچی رکھ کے چند گھونٹ حلق میں نکالیتی۔ کئی بار اس نے بوتل سنان کو بھی دی۔ وہ دونوں مسلسل بول رہے تھے۔ کبھی کسی گروپ میں شامل ہوکر کبھی تنہا ہوکر۔

ماموں کا سر فخر سے بلند تھا۔ آنے والے کئی دنوں تک وہ اپنی ورک شاپ میں بتاتے رہے۔

"اور جب میں یونی ورسٹی گیا' دراصل اس دن میں یونی ورسٹی گیا۔ میری بھانجی ہے نا وہ پڑھتی ہے وہاں۔ لوگ ایسے ہی ماحول کی باتیں کرتے ہیں۔ وہاں تو کسی کو سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ دراصل۔"

✲ ✲ ✲

اپنی نئی زندگی میں وہ بری طرح جت گئی تھی۔ یہاں پڑھائی بہت وقت مانگ رہی تھی۔ یونی ورسٹی گھر سے اتنی دور تھی کہ فاصلہ سوچتے سوچتے بندہ تھک جائے۔ وہ ڈھائی اور تین بجے تک گھر پہنچ پاتی۔ ایک گھنٹہ کے آرام کے بعد اس کے پاس اب چند اسٹوڈنٹ تھے۔

میٹرک کے لڑکے لڑکیاں۔ گلی کے نکمے لڑکوں کو خود والد بزرگوار دہلیز پر پٹخ جاتے۔ گھر والے سب حق دق رہ جاتے جب وہ شجرة کے آگے چیں بھی نہ بول پاتے اس نے چھوٹے موٹے بچوں کو فارغ کردیا تھا۔ صرف چنیدہ میٹرک کے بچے۔ فیس منہ مانگی۔

وہ لباس کا خیال رکھنے لگی تھی اس نے ماں سے کہا تھا' وہ اپنی پڑھائی کے لیے جی جان سے محنت کرتی ہے' مگر رقم کم ہے' وہ اسے ہر ماہ پنشن سے رقم دیں اور فضول کمیٹیوں میں پیسے مت پھنسائیں۔ محسنہ تابع دار ہوچکی تھیں۔ مان گئیں۔

وہ چوٹی بنانے میں وقت صرف کرنے لگی تھی۔ کاجل سے بے نیاز آنکھیں اب اسے ویران لگنے لگی تھیں۔ حالانکہ ان میں دیپ جلنے لگے تھے۔ انہیں سنوارنے کے لیے اس نے کچھ سامان آرائش خرید لیا تھا۔

سنان الیاس سے جان پہچان دوستی میں اور دوستی اس مرحلے میں داخل ہورہی تھی جب خود کو مقابل کی آنکھوں سے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔

کتنے دن گزرے' سنان الیاس کو اس کی زندگی میں قدم رکھے ہوئے۔ وہ اس کا مددگار تھا۔ راہ نما سامع اس کی گویائی (اس کے دل کی کہنے والا)

دوستی کے آغاز میں یاد رہتا تھا اب جیسے بھولتا ہی نہیں۔

وہ خیال بد نہیں تھا کہ وہ لاحول پڑھ لیتی۔ وہم بھی نہیں کہ سختی سے سرزنش کردیتی۔ ایک عجب ناقابل فہم سی کیفیت میں گھر کے اسے سوچنا بڑا ہی عجیب تجربہ تھا۔ ایسے میں اسے دیکھنا۔۔۔ ملنا بات کرنا اسے لگتا وہ مشکل میں پڑجاتی ہے۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا' دونوں میں سے جو پہلے آجاتا۔ وہ مخصوص جگہ پر کھڑا رہ کر انتظار کرتا کہ ڈپارٹمنٹ تک اکٹھے ہی جائیں واپسی پر اکٹھے بس میں سوار ہوتے۔

حالات خراب نہ ہوتے تو وہ اس کے ہمراہ اتر جاتا۔ اسے ممکنہ جگہ تک پہنچا دیتا۔ وہ اب کریم آباد کے ٹھیلوں کے علاوہ شہر کے دوسرے ٹھیلوں کی خاک چھاننے بھی جاتے۔ وہ گھر میں اطلاع دے دیتی۔

"دبکس ڈھونڈنے جارہی ہوں' اتوار کے دن بازار لگتا ہے' سنان ہے ناساتھ۔"

وہ اب بھی شاعری کی کتابیں ڈھونڈتا تھا۔ شجرۃ کو اب تک اشعار سمجھ نہ آتے تھے' مگر اس کا مدہم میٹھا جذب سے بھرپور لہجہ دل میں اترنے لگا تھا۔ وہ بس بولتا رہے وہ بس سنتی رہے۔

زندگی تھی کہ قیامت تھی کہ فرقت تیری
اک اک سانس نے وہ وہ دیے آزار کہ بس

اس سے پہلے بھی محبت کا قرینہ تھا یہی
ایسے بے حال ہوئے ہیں مگر اس بار کہ بس

لوگ کہتے تھے فقط ایک ہی پاگل ہے فراز
ایسے ایسے ہیں محبت میں گرفتار کہ بس

"کیسے لگے؟" وہ ہر بار پوچھتا تھا۔ کھوئی ہوئی شجرۃ چونکتی۔

"اچھے بہت اچھے۔"

وہ ذرا سا چہرہ نیچے کرکے اس کی آنکھوں میں جھانکتا' زور سے ہنس دیتا۔

"جب سمجھ میں نہیں آتا تو سنتی کیوں ہو۔ اور گھڑا گھڑایا جواب۔ اچھا بہت اچھا۔"

"محبت سمجھنے کی چیز کب ہے؟" جملہ جیسے پھسل جاتا۔

"ہاں یہ بھی ہے۔" وہ فوراً" قائل ہو جاتا۔

"لیکن۔" اسے دھیان آتا۔ "تم نے محبت کو کب سے سمجھنا شروع کردیا۔"

"پتا نہیں۔" وہ فوراً" مکر جاتی۔ "میں نے تو بس جملہ کہا ہے۔"

"ہاں۔" وہ مان جاتا۔ "تم جملہ ہی کہہ سکتی ہو۔ تمہارا گہرائی سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔"

"تو تم اتنا گہرا غوطہ کھاتے ہی کیوں ہو۔ یہیں ذرا اوپر اوپر کیوں نہیں تیرتے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

شجرۃ اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ اس سوال کا جواب سیدھا سیدھا اظہار ہو جاتا۔ لڑکیاں "محسوس" کرنے میں ہمیشہ اولیت رکھتی ہیں' لیکن اظہار میں اولیت ان پر جچتی نہیں۔ شجرۃ نے فوراً" بات پلٹ دی۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم مجھے شعر سناتے رہو۔ سمجھاتے رہو۔ کبھی نہ کبھی تو۔۔۔"

"مجھے لگتا ہے' میں یونی ورسٹی میں پڑھنے نہیں آتا پڑھانے آتا ہوں۔ اردو ایڈوانس کا پروفیسر بن کر۔"

وہ جل کر کہتا تھا۔ شجرۃ ہنس دیتی۔

☼ ☼ ☼

"ایک منٹ کا سکون حاصل نہیں ہے آخر کب ختم ہوگا یہ اسکول۔"

اکتائی۔ تلخ اور غصیلی یہ آواز آفاق بھائی کی تھی۔ دوپٹے کی بکل لپیٹے تختہ سیاہ کو چاک سے سفید کرتی شجرۃ حساب کے سوال کے آخری مرحلے پر تھی۔ وہ رکوع کی سی حالت میں جھکی بالکل نیچے لکھ رہی تھی۔ چونک کر سیدھی کھڑی ہوئی اور آفاق بھائی کو دیکھنے لگی۔ سارے اسٹوڈنٹس کی گردنیں بھی گھوم گئیں۔

شجرۃ کے متوجہ ہو جانے پر انہوں نے سوال دہرایا نہیں کہ تاثرات میں تفصیل سے درج تھا۔ وضاحت کے ساتھ۔۔۔ شجرۃ نے گردن موڑ کر باقی اہل خانہ کو دیکھا۔ وہ سب چونکے تھے۔ حیران ہوئے تھے اور ایک بخ بستہ بے بس آہ بھر کے ایک بار پھر اپنے اپنے اعمال میں مگن ہوگئے۔ شجرۃ نے دل میں امنڈ کر آتی ناگواری کو تھپکا اور اسٹوڈنٹ کو ڈپٹا۔

"واپس گھومو تم سب لوگ۔۔۔ سوال سمجھ میں آگیا ہے تو اتار لو اور اگر کہیں کنفیوژن ہے تو ابھی کلیر کروالو۔ آج یہ ایکسر سائز ختم کرنی ہے۔" سب نے کورس میں مگر جیسے زیر لب "یس ٹیچر" کہا۔

اسد کھڑا ہوگیا۔

"سارا سمجھ آگیا ہے بس یہ جب فارمولے کے ساتھ اپلیچ کرکے کرتے ہیں تب۔"

وہ کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ٹیچر کے بھائی سے خائف ہوکر اٹک اٹک کر بہت آہستہ سے بول رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم میرے پاس آجاؤ۔" شجرۃ نے کہا پلاسٹک کی دو کرسیوں کے بیچ ٹیبل تھی۔ اپنی کاپیاں سنبھالتا اسد گرتا پڑتا کرسی تک آیا۔ باقی سب سوال آتے تھے۔

"ہاں۔ اب بولو۔ کہاں آکر نہیں سمجھ پاتے تم؟"

"اور وہ جو میں نے بکواس کی ہے۔ اس کا کوئی اثر ہے بھی کہ نہیں۔" آفاق بھائی اب مروت کو طاق رکھتے سب کے سر پر پہنچ گئے تھے۔

شجرۃ نے نگاہیں اٹھائیں۔ ان میں غصیلا پن' ناگواری اور اپنے کام سے کام رکھنے کی تنبیہہ با آسانی پڑھی جارہی تھی' مگر جب وہ بولی تو لہجہ' جملہ اور آواز بالکل سادہ تھی۔

"بس چھٹی ہونے ہی والی ہے۔"

یہ اتنے بڑے شہر میں تم لوگوں کو کوئی اور استانی نہیں مل رہی جو۔"

اسٹوڈنٹ لڑکے منہ اٹھا کر آفاق بھائی کو دیکھنے لگے اور لڑکیاں سر جھکا کر خاموش ہوگئیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ بڑے پرسکون ماحول میں ٹیوشن ملتی تھی۔

"کیوں شور کرتا ادھر آگیا ہے آفاق۔۔۔ چلو بچو! تم لوگ اپنا کام نبٹاؤ' بخار ہے تمہارے آفاق بھائی کو۔ بس ذرا اس لیے۔" بڑی ماں کہیں اندر سے سب سنتی آئی تھیں۔ کہنے کے ساتھ ساتھ وہ انہیں اندر بھی دھکیلنے لگیں۔

شجرۃ کے چہرے پر غصے نے سرخی پیدا کردی تھی۔ اس نے محسنہ کو گھورا تھا اور چھوٹی ماں کو بھی جن کے چہرے تاسف اور فکر مندی میں گم ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آنے والے اگلے دن سب کے لیے مشکل بن کر آرہے تھے' مشکل۔۔۔ ناقابل حل۔۔۔ بے بسی۔۔۔ ایک سناٹا درودیوار سے کائی کی طرح لپٹ گیا تھا۔ سائے کی مانند سر پر تن گیا تھا۔ حیرت آمیز بے بسی کے ہوکے۔ ہما بھابھی کے چہرے پر چھائی خاموشی اور آنکھوں سے جھانکتی وحشت وہ کبھی کبھار بے روح نظر آتیں اور آفاق بھائی۔

آفاق بھائی کسی بدروح کی طرح ہر سو منڈلاتے۔ وہ کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ کبھی دیوار پر مکا مارتے اور کبھی سامنے آئی کسی بھی شے کو ٹھوکر۔ ایسے میں مامیاں اور محسنہ منہ چھپا چھپا کر آنسو پیتیں۔ ہچکیاں روکنے کو کھانستیں۔

وہ انکشاف کا عذاب جھیل رہے تھے اور کسی کو بخشنے پر تیار نہ تھے سب ہی عتاب کا نشانہ' مگر شجرۃ کو لگا کہ وہ ان کی ہٹ لسٹ پر آگئی ہو۔ اس نے محسنہ سے شکایت کی۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھپتھپا کر بس خاموشی کی تلقین کردیتیں' مگر شجرۃ کو برداشت کی عادت نہ تھی اسے سوچ لینے کی عادت تھی۔ کہہ دینے کی خواہ خود کلامی ہو' مگر اب اس کے پاس ایک سامع تھا نا۔ بہت کچھ تھا اسے بتانے کو' پوچھنے کو' سمجھنے کو' خود اس کے حوالے سے بھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں یہ کیوں لگتا ہے کہ جو غم تم پر پڑا ہے' وہ ہی سب سے بڑا ہے؟ دنیا میں ایک سے ایک بڑی باتیں ایسے ایسے دکھ کہ فقط سن کر کلیجہ منہ کو آجائے اور تمہارے آفاق بھائی کے لیے تو پھر یہ بہت بڑی بات ہے۔"

"تو وہ میرا جینا کیوں حرام کررہے ہیں۔"

"یار! ان کی اپنی زندگی حرام ہو چکی ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے لیے کبھی کم پر راضی نہیں ہوتا۔ اسے پرفیکشن چاہیے ہوتی ہے' مادی چیزوں کا کہہ رہا ہوں۔ اور اگر بات پھر اپنے ذاتی وقار پر آجائے تو۔۔۔"

"تو میرا کیا قصور۔۔۔؟" وہ چلائی تھی۔

"قصوروار تو وہ بھی نہیں ہیں شجرۃ۔۔۔!" سنان کا لہجہ زخمی ہوگیا۔ "وہ قصداً" مسکرایا۔

"کسی مرد کے لیے یہ احساس کہ وہ اپنی بے اولادی کا ذمہ دار ہے۔ اس کی موت ہے۔ بس یہ ہے کہ اسے دیا نہیں جاسکتا۔" شجرۃ نے نگاہیں چرائی تھیں' اس نے شدید غصے میں جب بولنا شروع کیا تو سب ہی بول گئی' لیکن اب ذرا ٹھنڈے ہونے پر اسے کسی قدر خجالت نے گھیر لیا تھا۔

"وہ جتنا بھی رد عمل دیں کم ہے۔ ہاں یہ ہے کہ کچھ وقت کے بعد وہ۔ جب تسلیم کرلیں گے تو پھر ہر شے اپنی جگہ پر آجائے گی انہیں وقت دینا ہوگا۔"

"تم اتنی آسانی سے یہ سب کیسے کہہ رہے ہو' بڑے تجربہ کار ہو؟"

"میری بہن ہیں بڑی۔ چھ سال ہوگئے ہیں' وہ ماں نہیں بن پائیں۔ بظاہر کوئی نقص نہیں ہے۔ وہ جس طرح کی زندگی جی رہی ہیں۔ اسے محسوس کرنے ہی میں جتنی اذیت ہے' وہ تم نہیں سمجھ سکوگی۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم ہر چیز کو اپنے حوالے سے دیکھتی ہو۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ اکیلی تم ہی دکھی ہو' مختتی ہو۔ تم ہی مشکل میں ہو' تمہارے ہی مسائل ہیں جبکہ دنیا کا ہر شخص ایک امتحان میں پڑا ہے۔ ہر انسان کی اپنی مصیبت۔ اپنے دکھڑے۔۔۔"

دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے آخر میں کچھ سنجیدہ ہوگیا تلخ ہوگیا۔ شجرۃ چونکی۔

"کیوں! تمہیں کیا دکھ۔۔۔؟"

"کیوں اپنی آپی کی پریشانی میرے دل کو نہیں چیرتی۔ اس پر یہ خیال۔۔۔ کہ میں ان کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ پریشانی تو کوئی بھی ہوسکتی ہے نا؟ اب یہی دیکھو۔ میری اماں آج کل کتنی پریشان ہیں۔" وہ ہنس پڑا۔

"اماں پریشان ہیں اور تم ہنس کررہے ہو۔" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "تمہیں کیا پریشانی ہے خیریت؟"

"ان کی پریشانی۔" سنان ہنستے ہوئے آسمان کو دیکھنے لگا۔ "تم بھی ہنس دوگی' میں نے کہا نا' ہر شخص کے لیے اس کا دکھ سب سے بڑا۔ اپنی آنکھ کا تنکا شہتیر ہی ہوتا ہے۔"

"تم بتاؤ تو۔۔۔ عجیب آدمی ہو۔ ماں کی پریشانی کا ذکر کرتے ہو اور دل کھول کر ہنستے ہو۔ پاگل ہو۔"

"میں نو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ امی اتنی بوڑھی ہیں جیسے میری دادی ہوں۔ انہیں آج کل بس یہ فکر ہے کہ مجھے کون بیاہے گا۔ ہاہاہا!"

"لڑکے' بیاہ کرلاتے ہیں۔ اپنی گرامر درست کرو اور تم میں کیا برائی ہے جو وہ ابھی سے فکرمند ہورہی ہیں۔" شجرۃ نے اندر کی آنکھ کھول کر اسے دیکھا' ویسے وہ باہر کی آنکھ کو بھی پیارا لگتا تھا۔

سنان نے تاسف سے نفی میں گردن ہلائی پھر اپنی لنگ والی ٹانگ سامنے سیدھی کردی۔

"تمہیں سامنے کی چیز نظر نہیں آتی۔ تم گہری باتیں کیسے سمجھ سکوگی؟"

"یہ۔۔۔!" وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ لنگ کہتے کہتے رکی۔ یہ سچ تھا۔ وہ قطعاً" نمایاں ہونے والی چیز نہیں تھا' مگر۔۔۔

"یہ تو نظر ہی نہیں آتا۔ پتا ہی نہیں لگتا؟ اور۔۔۔ تم۔۔۔"

"تم کمال ہو شجرۃ الدر۔۔۔ یہ اتنا نظر آتا ہے کہ اس کے سامنے میں نظر نہیں آتا۔"

"کس کو۔۔۔؟"

"ان سب کو جو پہلے مجھے دیکھتی تھیں۔"

"دیکھتی تھیں؟"

"ہاں۔ میری کزنز اور ان کی امیاں اور باجیاں۔" وہ مزے سے بول رہا تھا۔

"اور اب وہ تمہیں نہیں دیکھتیں؟"

سنان نے جواب نہیں دیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر دور مارنے لگا تھا۔

"میں تمہیں دیکھتی ہوں سنان۔" وہ شاید تسلی دے رہی تھی۔

"جانتا ہوں۔ تم دیکھتی ہو۔ مگر صرف چہرہ۔ تم پورا جائزہ لینے کی عادی جو نہیں ہو۔"

اس نے ایک جملے میں شجرۃ الدر کی پوری شخصیت کو واضح کردیا تھا۔ شجرۃ کے پاس ایک فوری خوب صورت جواب تیار ہوا مگر اس نے لب بھینچ کر جیسے اپنی خامی کو مانا۔

اس کا خراب موڈ بحال ہوچکا تھا۔ وہ آفاق بھائی کی کیفیت اور دکھ کو جیسے سمجھنے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

آفاق بھائی غم واندوہ کے اندھیروں میں ڈوب گئے تھے۔ خاموش' متفکر' بے چین یا پھر چیختے ہوئے' ٹھوکریں مارتے ہوئے' بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتے۔

مغلظات بکتے تھے۔

ان کا عتاب ہر ایک کے لیے تھا۔

بلاوجہ ہما بھابھی کو پیٹ ڈالا جو منہ پھیر کر آنسو چھپا رہی تھیں۔

ورک شاپ میں کسٹمرز سے الجھے اور بڑا ہتھوڑا ہاتھ میں اٹھالیا۔ (سر پھاڑنے کے لیے) غازیہ ماذیہ میکے آئیں۔

"میرا تماشا دیکھنے آئی ہو؟ اچھا اپنے بچے دکھانے لائی ہو۔"

"نہیں بھائی۔" وہ دونوں سکتے میں آگئیں۔

آفاق کوئی گھٹیا فلمی پلان۔۔۔ میکر تو تھے نہیں کہ اپنی ڈاکٹری رپورٹ چھپالیتے جو ڈاکٹر نے کہا۔ وہ سان و گمان میں بھی نہ تھا جب موت کی سی حالت میں گھر پہنچے تو ماں کے استفسار پر بولتے چلے گئے سب کچھ۔

اب سوچ رہے تھے۔ "سب اچھا" کی رپورٹ دے دیتے۔ کون رپورٹ کو انویسٹی گیٹ کرنے جاتا سب صبر شکر کرکے بیٹھ جاتے۔ وہ ماں باپ کو اعتماد لے کر کہہ سن لیتے' مگر اس صدماتی جذباتی لہجے میں وہ سب کے سامنے سب کچھ بول گئے۔

ایک نارسائی کا دکھ۔۔۔ دوسرے سب کے باعلم ہونے کی پریشانی' سب کے دشمن ہوگئے' مگر شجرۃ الدر کے ساتھ تو۔۔۔

انہوں نے گھر کی کلاس کو نشانہ بنایا۔ "اتنے بڑے بڑے جوان جہان گھوڑے لڑکے (میٹرک اور نائنتھ) دندناتے گھر میں گھس آتے ہیں' کوئی شرم حیا ہے کہ نہیں۔۔۔"

شجرۃ بلیک بورڈ پر جھکی ہوئی تھی۔ پیچھے دو لڑکے آپس میں کچھ سرگوشی کررہے تھے۔ کوئی شرارت۔۔۔ ایسے ہی۔ آفاق نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ایک دھاڑ لگائی اور پھر انہیں جس طرح پیٹنا شروع کیا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

ایک ہنگامہ۔۔۔ افسوس' شرمندگی' جھگڑا بے عزتی اور بے روزگاری۔ شجرۃ کے لیے سراسر نقصان' اس کا تو بیڑا غرق ہوجاتا۔

وہ چیخ چیخ کر سب کے سامنے اپنی صفائی اور ان کی زیادتی بتارہی تھی۔

"اس طرح کے بی ہیوئیر سے کون آئے گا پھر ادھر۔۔۔"

"تو آئے ہی کیوں؟" آفاق اکڑے کھڑے تھے۔

"میرا روزگار ہے یہ۔ میرا ہنر۔۔۔ میں خود کو افورڈ کرتی ہوں اس سے۔ گل چھرے۔ ضرورت ہے میری یہ آمدنی۔" سب اس کے بیان کی تائید کررہے تھے۔ (دل میں)

"ہاں گل چھرے اڑانے کو وہ لڑکا ہے جس کے ساتھ دن کے آٹھ نو گھنٹے گزارتی ہو۔"

"آٹھ نو گھنٹے؟ میں یونی ورسٹی جاتی ہوں۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔ "پڑھنے کے لیے۔"

"ہا۔۔۔ پڑ۔۔۔ ھن۔۔۔ نے۔۔۔؟" آفاق کا انداز استہزائیہ تھا۔

"پڑھائی کلاس میں ہوتی ہے' جانتا ہوں۔ پھر کینٹین میں اور پارک میں اور لمبے رستے میں ٹہلتے ہوئے پھر ایک ہی بس۔ وہ اکثر ساتھ چھوڑنے آجاتا ہے۔ راستے میں کون سا لیکچر چل رہا ہوتا ہے۔ یہاں گھر میں تو ایسے چپ رہتی ہے جیسے منہ میں زبان ہی نہیں اور اس کے ساتھ کیسے فرفر زبان چلتی ہے۔"

"جب کلاس ایک ہے' مضامین ایک ہیں۔ راستہ ایک ہے۔ بس کا روٹ ایک ہے تو ساتھ تو رہے گا نا۔" اس نے جیسے منہ توڑ جواب دیا تھا۔

"ہا۔!" وہ منہ کھول کر ہنسے۔ "ہمدانی صاحب کی دو بیٹیاں یونی ورسٹی جاتی ہیں ان کو تو کبھی ہم سفر نہ بنایا۔"

شجرۃ نے کچھ کہنے کو لب کھولے پھر بھینچ لیے۔

ہمدانی صاحب ناظم کا الیکشن لڑ چکے تھے۔ ہار گئے تھے' مگر رہتے یوں تھے جیسے ایم این اے ہوں۔ یہی پُرغرور رویہ بیٹیوں کا تھا۔ ڈان بن کر رہتیں۔ شجرۃ کا گزارہ کیسے ہو سکتا تھا ان کی طرح مگر اب یہ کیسے بتایا اور سمجھایا جائے۔

"ایک پلیٹ میں بریانی لی جاتی ہے اور پونے گھنٹے میں ختم ہوتی ہے۔ چھٹانک بھر کی وہ پلیٹ۔ باتیں جو ختم نہیں ہوتیں۔"

شجرۃ بری طرح چونکی وہ اب بھی پر اٹھا لے کر جاتی تھی مگر کل کل پیریڈ کی ہڑبونگ میں جب وہ بھاگی تو لنچ کا اخبار میں رول پراٹھا نجانے کہاں رہ گیا بھوک نے پاگل کر دیا تب ہی اس نے بجٹ پر لعنت بھیجتے ہوئے مگر۔۔۔

"آفاق بھائی کو کون دے رہا ہے ایسی خبریں؟" اس کے سر پر ڈنڈا سا برسا۔

آفاق بڑی جتاتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

جب ہم خود دکھ میں پڑتے ہیں تو دل چاہتا ہے' ہر ایک دکھی ہی نظر آئے ہنستے چہرے زہر لگنے لگتے ہیں۔

جب ہم اپنا اعتماد کھو دیں تو دوسروں کی خود اعتمادی تازیانہ بن کر لگتی ہے۔

شجرۃ کی مضبوط شخصیت اور اعتماد سب سے زیادہ کھلنے لگا تھا۔

اسے ذرا برابر بھی پروا نہیں کہ وہ کس مصیبت میں پڑے ہیں۔

سراسر بے وقوفی۔ احمقانہ خیال اور بے شرم سا شکوہ۔

مگر وہی نا کہ اس کی لگن پھلتی پھولتی بحالی کی راہ پر گامزن زندگی سے یونہی حسد ہونے لگا عنادپال لیا۔

پھر یہ بھی تھا کہ سب چپ ہو کر سن رہے تھے جبکہ شجرۃ الدر آگے سے تابڑ توڑ جواب دیتی' سانس تک نہ لیتی' سوچ بچار تو لمبی کہانی رہی۔

نتیجہ۔۔۔

آفاق بھائی نے ٹیوشن والے لڑکوں کو دروازے پر جالیا اندر گھستوں کو سینے پر پنجہ دھر کے پیچھے دھکیلا۔ منہ سے کچھ نہ بولے۔ چٹکی بجائی بھرسٹی اور سخت قطعیت سے بھرپور تاثرات کے ساتھ واپسی کا اشارہ کیا۔

"ختم ٹیوشن۔ کہیں اور بندوبست کرو۔"

لڑکیوں سے کچھ نہ کہا۔ وہ خود ہی گھبرا گئیں۔

اس دن پڑھائی نہ کی جا سکی۔

☼ ☼ ☼

"لیکن ہم کسے تلاش کر رہے ہیں۔" سنان اس کے پیچھے لپکتے ہوئے چلایا تھا۔ "اور کیوں؟"

"بس تم ساتھ چلو۔" وہ مڑے بغیر عجلت سے بولی۔

"اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ شجرۃ کی ذہانت کو کون پہنچ سکتا ہے۔" اگلا جملہ حسب عادت خود کلامی تھا۔ سنان نے شانے اچکائے۔

شجرۃ گھر سے سارا حساب کتاب لگا کر نکلی تھی۔ سو اسے الجھنے کا ڈر نہیں تھا چونکہ اس کے ذہن میں ٹارگٹ کلیئر تھا لہٰذا وہ سیدھے پولیس موبائل تک گئی۔ یونی ورسٹی میں کسی بھی قسم کی بدامنی' دنگا فساد نہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے جگہ جگہ پولیس اور رینجرز کی چوکیاں قائم تھیں۔ شجرۃ کا مقصد اسی موبائل میں کسی کی تلاش تھی یا پھر وہ چوکی جو کینٹین کے نزدیک ہو۔

اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ وہ تلاش کے لیے پرجوش تو تھی مگر ہوش میں بھی تھی۔ اس نے خود کو مخفی رکھا تھا۔

یک دم اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ سنان ٹھٹھک کر رک جانے پر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"بندوق اس کے ہاتھ میں ہے۔ تانے کھڑا ہے الرٹ میرے وطن کا بانکا سپاہی اور مار دینے کے عزائم تمہاری آنکھوں میں؟ یہ کیا کہانی ہے خاتون۔"

سنان نے شوخ لہجے میں پوچھا۔ شجرۃ سپاہی پرویز خان کو گھور رہی تھی۔ کھا جانے والی نگاہوں سے۔ غصیلے تاثرات اتنے کڑے سے کڑے ہوتے جا رہے تھے کہ کسی پل وہ آگے بڑھے اور وہی گن جسے تھامے وہ کھڑا ہے اسی پر خالی کر دے۔

"کیا ہوا شجرۃ۔ کیا بات ہے؟" سنان نے سنجیدگی سے کہا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ آؤ چلیں۔"

"لیکن ہم یہاں آئے ہی کیوں تھے' کرنا کیا تھا؟"

"جس لیے آئے تھے' وہ کر کے ہی جا رہے ہیں۔"

شجرۃ کا لہجہ ٹھنڈا انکار تھا۔

☼ ☼ ☼

شجرۃ نے گھر آ کر ہنگامہ کر دیا۔

"وہ پرویز خان۔ آفاق بھائی کا بچپن کا دوست' ایک سال سے ہے وہاں تعینات۔ پہلے تو کچھ نہ بولا۔ آفاق بھائی میری مخبری کروانے لگے ہیں اس سے۔۔۔" وہ آگ بگولا ہو رہی تھی۔ "پہلے میرے رزق روزی پر لات مارنے کی کوشش کی۔ بچوں کو ڈرا کر بھگا دیا' اللہ جانتا ہے۔ کس مشکل سے وہ دوبارہ آئے ہیں۔ پہلے میرا ہاتھ اوپر تھا' اب وہ مجھ پر احسان جتا کر آ رہے ہیں' میں نے آج تک کسی کی بات نہیں سنی اور اب؟" اس نے جھرجھری سی لی۔

"اور کل تو حد ہو گئی۔ دس نمبر پر کھڑے تھے مجھے واچ کر رہے تھے کہ کیسے آتی ہوں۔ جیسے روز آتی ہوں ویسے ہی آئی ہوں۔ سنان ساتھ ہی تھا۔ وہ آگے بفرزون کی جانب جاتا ہے۔ میں اتر جاتی ہوں۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔ آپ بھی جانتی ہیں۔"

"میں ملی ہوں شجرۃ۔ اس لڑکے سنان سے' بہت اچھا ہے۔ وہ کسی اچھے گھر سے ہے۔ تمیز دار بھی ہے اور تم نے بتایا بہت لائق بھی۔ ہم جماعت ہے تو ملنا جلنا تو رہے گا۔ کوئی قباحت نہیں' لیکن ذرا کم کرو۔ بھائی کو اچھا نہیں لگتا تو۔"

"امی! میرے اچھے برے میں کوئی نہیں ہے' میں خود ذمہ دار ہوں۔ کسی کو کیا تکلیف۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔"

"ہاں!" محسنہ نے سانس بھری۔ "یہی تو کہہ رہے ہیں اب تم بچی نہیں ہو۔"

"اس بات کا کیا مطلب؟ خیر آپ سمجھالیں ان کو۔ میں اپنی زندگی کے معاملات میں آزاد ہوں۔" وہ چلائی۔

مگر آنے والے کچھ دنوں میں بڑے اور چھوٹے دونوں ماموں بھی آفاق بھائی کے ہم خیال ہو گئے۔ اشفاق نے بھی دونوں کو پیدل آتے دیکھا اسے بھی بہت برا لگا۔

ذرا سی بات بڑھ کر داستان بن رہی تھی۔ بیوگی اور یتیمی کے سفر میں ایسا مشکل موڑ پہلے تو کبھی نہ آیا تھا۔ سہل' پُرسکون' خراماں خراماں زندگی۔

سب ایک جانب۔ شجرۃ ایک جانب۔ درمیان میں محسنہ۔

اب جیسے اپنی ساری توانائی اس چھوٹی سی لڑکی کو پچھاڑنے میں لگانے لگے۔

ہنگامہ۔ فیصلہ۔ شور۔ احسان۔۔۔ سے احسان فراموش تک کا طعنہ۔ محسنہ کی جان مصیبت میں۔ آفاق غلط بھی نہیں تھے۔

"تو۔۔۔ تو مان کیوں نہیں جاتی شجرۃ۔۔۔ بحث کیسی؟"

"نہیں مان سکتی امی۔۔۔ نہیں چھوڑ سکتی اس سے ملنا۔۔۔ وہ میرا سامع ہے' میرا راہ نما۔ میرا راستہ۔۔۔ وہ میرے بارے میں وہ سب جانتا ہے جو آپ بھی نہیں جانتی ہیں۔ میں بھی نہیں جانتی ہوں۔ میں اس کے اندر اپنے سارے رشتے دیکھتی ہوں۔ وہ کبھی "آپ" بن جاتا ہے۔ کبھی "بہن" بن جاتا ہے کبھی بھائی۔۔۔ نیچر تو وہ ہوتا ہی ہے۔ حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ کبھی کبھار تو وہ مجھے "ابو لگنے لگتا" ہے۔ دوست کہوں

گی تو اس رشتے کی مرد و عورت کے بیچ جگہ نہیں ہوتی۔ اس کے میرے بیچ کوئی "رشتہ" نہیں ہے، مگر امی! جو سب ابھی میں نے بتائے، وہ کیا رشتے نہیں ہیں؟"

اس کے جملوں میں ساری یتیمی، تنہائی، نارسائی کی داستان سمٹ آئی۔

"بالکل نہیں ہیں۔ ان سب کو فقط جذباتی باتیں کہا جائے گا۔ ان رشتوں کو نہ اللہ مانتا ہے نہ اس کی کتاب میں ان رشتوں کے اصول و ضوابط لکھے ہیں اور رہی دنیا... اللہ اور اس کی کتاب کی جواب دہی آخرت میں ہوگی۔ دنیا میں جیسا مرضی کھل کھیلو مگر دنیا۔ یہ ہمارے اردگرد کے لوگ...

یہ ہر روز کی بنیاد پر سوال نامہ ترتیب دیتے ہیں بلکہ ہر منٹ پلکوں کی جنبش اور سانسوں کی رفتار پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ انہیں روز کی بنیاد پر جواب دینے ہوتے ہیں۔ اس پر کمال یہ کہ گھری گھما پھرا کی گئی باتیں تو سمجھتے ہی نہیں۔ سیدھا اور صاف جواب چاہتے ہیں تم ان رشتوں کی کوئی وضاحت ان کو نہ دے سکو گی۔ دنیا سے ڈر کر چلنا پڑتا ہے بلکہ دنیا کے بتائے دکھائے طے شدہ راستے پر ہی چلنا ہوتا ہے تم..."

"میں نے نہیں ماننی کسی دنیا کو اور دنیا کی باتوں کو۔ میری اپنی دنیا اپنی زندگی ہے، جس کو میں اپنی مرضی سے جیتی ہوں۔ دنیا کون ہوتی ہے سوال کرنے والی۔" شجرۃ نے بات کاٹ کر درشتی سے کہا تھا اسے پتنگے لگ گئے تھے مگر ساتھ ہی وہ محسنہ کے جملوں کی سادگی مگر گہرائی سے حیران بھی ہوئی تھی۔ وہ جو بہت کم پڑھی لکھی تھیں اور ہمہ وقت نمک مرچ میں جتی رہتی تھیں ایسی مدلل گفتگو بھی کر سکتی ہیں؟

شجرۃ بے وقوف تھی۔ اسے خبر نہیں تھی۔ محسنہ کو عام حالات میں اس موضوع پر بولنے کے لیے کھڑا کیا جاتا تو وہ جھینپ کر معذرت کرتیں۔ وہ کیا کہیں؟

مگر اس وقت وہ "ماں" تھیں جو بیٹیوں کی عزت و مرتبہ کی حفاظت کے لیے ہر میدان مارنا جانتی ہے، خواہ ہاتھ سے مارنا ہو یا زبان سے۔

شجرۃ کو پتا نہیں تھا۔ ایسی صورت حال میں مائیں پڑھی پڑھائی ہوتی ہیں، کیوں نہیں مانتیں دنیا... دنیا ہی سب کچھ ہے۔ "دنیا کے سامنے" جتنی صحیح زندگی گزاری ہوگی۔ آخرت کا سوال نامہ اتنا ہی ہلکا ہوگا۔

کیوں پہنتی ہو لباس... استری کر کے سلیقے سے۔ پتے کیوں نہیں باندھ لیتیں۔ جسم ہی تو ڈھانپنا ہے نا۔ دنیا کے ڈر سے سوچو، پتے باندھ کر نکلیں تو۔" محسنہ نے قصداً" جملہ ادھورا چھوڑا۔

"سالن کٹوری میں کیوں لیتی ہو۔ ہاتھ میں ڈلوالیا کرو۔ مگر نہیں "کٹوری" طریقہ ہے۔ سلیقہ ہے۔ علم اور عقل۔ کٹوری دنیا ہے۔

کیسے کہہ دیا کہ دنیا کی پروا نہیں ہے؟ دنیا سب کچھ ہے۔ اس کے طے کیے راستے پر ہی چلنا پڑتا ہے۔

آج لوگ بے خبر ہیں۔ کل کو جب باعلم ہوں گے تب۔ سب باتیں کریں گے۔ تم کیسے وضاحت دو گی۔"

محسنہ کے جملے سوشیالوجی کی کسی کتاب میں کوٹیشن کے طور پر درج کیے جانے کے لائق تھے۔ شجرۃ منہ کھول کر ماں کو دیکھ رہی تھی۔

سامنے بولتی عورت محسنہ نہیں تھیں۔ وہ ایک "ماں تھی" جو اپنی بیٹی کو وہ سبق پڑھا رہی تھیں جو کسی کتاب کے نصاب کا حصہ نہیں ہوتا۔ شجرۃ کی بولتی بند ہو گئی تھی۔

"رشتہ کیا بہت ضروری ہے امی؟" اس کا لہجہ ٹوٹ گیا۔

"ہاں!" محسنہ نے کہا۔

"رشتہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ شجرۃ! سیدھی سادی زندگی کو کیوں مشکل بنا رہی ہے بچی! آج فقط آفاق چلا آیا ہے، اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ انداز اور طریقہ غلط ہے، مگر بات غلط نہیں ہے۔ کل کو کوئی انہیں روک کر کہہ دے تمہاری بہن کو دیکھا تھا فلاں لڑکے کے ساتھ۔ بھائی بے پروائی سے تم پر یقین کر بھی لیں گے تو اگلے کو کبھی بھی نہیں دلوا سکیں گے۔ بحث نہ کر۔ چھوڑ دے اس ضد کو۔ ہم جماعت ہے اچھا لڑکا ہے بس جماعت تک ہی محدود رکھ۔"

"نہیں چھوڑ سکتی۔" محسنہ کے جملے پر وہ سماعت سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ہی دھن میں تھی۔ کھو گئی تھی۔ آواز دھیمی تھی مگر عزم بلند۔ محسنہ نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

"میں اس سے محبت کرتی ہوں امی!"

"محبت... ؟ وہ کیا ہوتی ہے؟" ابھی کچھ دیر پہلے عالم و فاضل جملوں گہری حکایتوں کا ڈھیر لگا دینے والی محسنہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔



محبت اوس کی صورت

پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے

گلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے

سحر کے جھٹ پٹے میں گنگناتی ہے۔ مسکراتی ہے

جگمگاتی ہے۔

محبت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے۔

کسی فردوس کی صورت۔ محبت اوس کی صورت۔

اسے دس برس کی اس عمر میں نظر انداز کیے جانے کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے وجود کی نفی۔ بے معنی حیثیت... اسے لگتا۔ وہ کسی کے دست طلب کی دعا نہیں ہے۔ یونہی فالتو سا اب وہ زیادہ گہرائی سے سوچنے لگا تھا اور کھوجنے کی سعی... اسے کڑیاں جوڑنا نہیں آتی تھیں۔ پزل حل کرنے آتے تھے، مگر پزل کے بکھرے ٹکڑے اس کے پاس نہیں تھے۔

دھتکارے جانے کا احساس... لایعنی سے کچھ شکوک حقیقت تھے جب وہ پانچ برس کا تھا تو اسے لوٹا دیا گیا یعنی دھتکار دیا گیا لیکن نہیں۔ جب وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ پنگھوڑے میں تھا۔

نہیں... تب بھی نہیں۔ جب وہ پیدا ہوا تھا۔ تب بھی ایک انکار تھا۔ حیرت تھا۔ ناپسندگی بے عزتی اور شرم تھا۔ ایسا سوال جس کا جواب منہ چھپانے پر مجبور کر دے، بغلیں جھانکنے پر۔ دنیا اسے ناجائز سمجھتی تھی۔ جبکہ (وہ ناجائز تو نہیں تھا۔ تو کیا جائز تھا؟)

مگر اس مشکل سوال سے زیادہ مشکل میں اس کی ماں تھی اس سے اور دیگر لوگ۔

کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ درد سے تڑپتی اس کی ماں کو اسپتال جانے پر کیسے قائل کیا جائے۔ اور گھر کی دائی مائی۔

اور ابھی تو فقط جانے کا مسئلہ تھا۔ واپس لوٹنے پر کیا ہوگا۔ اس کے باپ کو گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گلی کے کونے میں گاڑی کے شیشے گرائے بیٹھا تھا۔

نویں مہینے کی آغاز پر ہی وہ سوچنے لگی تھی کہ بس کون سی گھڑی ہو اور وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پائے۔ ڈاکٹر اور دائی دونوں کے خیال میں نویں مہینے میں کسی بھی وقت ڈلیوری ہو سکتی ہے۔

مگر اس بچے کو دنیا میں آنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یا پھر شاید وہ جانتا تھا کہ دنیا میں اس کے لیے فقط تھو تو ہی ہے۔ حقارت... طعنے نفرت۔ بوجھ... وہ دنیا میں آنے سے پہلے اتنی بڑی آزمائش تھا۔ تو بعد میں تو۔

اسے نویں ماہ کے آغاز ہی سے درد کے چھوٹے چھوٹے وقفے محسوس ہونے لگے تھے، شروع میں یہ درد بہت کم وقت کے لیے محسوس ہوتا۔ اور پھر دھیرے دھیرے دورانیہ بڑھنے لگا۔ لیکن درد کی شدت جیسی بھی رہی ہو۔ درد جب رک جاتا تو لگتا کہ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کی ماں ہر بار دائی کو بلالیتی اور وہ بڑے آرام سے کہہ کر چلتی بنتی "ابھی وقت ہے۔"

اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر مہینے کی آخری تاریخیں درج تھیں۔ اسے ہر صورت وہاں جانا تھا مگر یہ مصیبت۔ دنیا سے چھپ کر گھر کے سب سے اندرونی کمرے میں بیٹھی تھی۔ مگر ایک بار ڈاکٹر کے پاس بھی چلی گئی۔ بچتی بچاتی۔ اس کی بے حد بے چینی پر اس نے الٹرا ساؤنڈ لکھ دیا۔ اور الٹرا ساؤنڈ نے جو کنفرم تاریخ دی۔ وہ وہی تاریخ تھی جو اس کاغذ پر درج تھی۔ ہفت آسمان نظروں کے آگے گھومتا سمجھ میں آگیا۔ وہ چکرا گئی۔

"اس سے پہلے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد

نہیں۔ اس کے بعد پھر ہم فوراً "سی سیکشن کی طرف جاتے ہیں۔"

"سی۔" وہ تھرا کر رہ گئی۔ آپریشن کی صورت میں وہ ہفتہ بھر اسپتال رہتی اور بعد میں نجانے کب فعال ہوتی جبکہ اسے تو۔

"آ۔ آپ ابھی کردیں آپریشن آج۔ کل۔"

"پاگل تو نہیں ہو۔ ہر چیز کا ٹائم اور پراسس ہوتا ہے۔ ماں بننا صبر کا دوسرا نام ہے۔ ابھی سے ٹریننگ کرو۔ بھاگ جاؤ۔"

ڈاکٹر نے دوائیوں کا بڑا پرچہ لکھ کر اسے جھاڑا اور نیکسٹ پیشنٹ کے لیے بیل بجادی۔

وہ گھر آنے تک اور بعد میں جیسے شدید ڈپریشن میں چلی گئی۔ سوچ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو گئی۔

دائی نے وقت پورا ہونے کا کہہ کر ساتھ ہی مشکل کیس بتایا اور آپریشن ہونے کی نوید سنادی اور وہ دہل کر رہ گئی۔

"نہیں اماں!" اس نے دائی کے ہاتھ تھام لیے۔ "آپ مجھے اس مشکل سے نکالیے۔ خدا کے لیے۔"

"اری زندہ رہے گی تو جائے گی ناں۔"

"مرجاؤں تو سارے مسئلے ہی حل ہوگئے ناں۔ لیکن ہائے۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"عجیب لوگ ہو تم لوگ۔ دائیوں کو بدنام کرتے ہیں کہ کیس خراب کردیتی ہیں۔ میں اپنے منہ سے کہہ رہی ہوں کہ لے جاؤ اور تم۔ پہلے بچے کی دفعہ کون رسک لیتا ہے اور آپریشن پر کون سے زیادہ پیسے لگتے ہیں۔ دس بارہ ہزار کا خرچا ہے وہ بھی اچھے اسپتال میں۔"

"بات پیسوں کی نہیں ہے۔" وہ چلائی تھی۔ پسینے سے تروجود خشک لب... اسے جھٹکے سے لگنے لگے۔

دونوں عورتیں اس کے نزدیک آگئیں۔ اس کی ماں نے تیزی سے کہنا شروع کیا۔

"پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا باپ نوٹوں سے بھرا تھیلا لے کر کھڑا ہے۔"

دائی کے کھلتے لب بند ہوگئے۔ اب بولنے کا نہیں کرنے کا وقت تھا۔ اور پتا نہیں گھڑی کی سوئیاں کتنا آگے سرکی تھیں۔ جب کمرے میں نومولود کے رونے کی آواز گونجنے لگی۔ چہار عالم میں اپنی آمد کا اعلان کرتا لڑکا۔

پیدائش کے عمل کے بعد مائیں بے دم، ساکت ٹھنڈے برف وجود کے ساتھ اسٹریچر پر پڑی سوتی ہیں۔ نڈھال، بند آنکھیں۔

مگر یہ انوکھی ماں تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ اسے اپنے اندر چوکڑیاں بھرتے ہرن کی سی توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر تارہ توڑ سکتی تھی اور ہاتھ جھکا کر سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے سیپ کا موتی۔

اس کی نظریں کیلنڈر پر تھیں۔ اور آنکھوں میں فاتحانہ چمک۔



شجرۃ نے الف سے بے تک کا سارا قصہ بیان کیا۔ (ماسوائے وہ آخری جملے)۔ جو محسنہ کے لیے شاک تھے۔ تو خود اس کے لیے بھی کہ اتنی آسانی سے کہہ دیے گئے)

اس کی آواز دکھ سے بوجھل ہوجاتی، کبھی لرز جاتی ...نم ہوجاتی۔

کبھی بہت چیختا ہوا اونچا لہجہ۔ اور اب اختتامی جملے کہہ لینے کے بعد وہ سنان کی جانب سے تائید کی منتظر تھی۔ وہ ہاں میں ہاں ملائے اور سراہے کہ اس نے بالکل درست کیا۔

لیکن جب وہ بولا۔

"تو ٹھیک ہے پھر تم مجھ سے ملنا چھوڑ دو۔"

"کیا؟" شجرۃ سن رہ گئی۔ "یہ تم کہہ رہے ہو۔ کیسے کہہ سکتے ہو تم یہ۔"

"تمہارے بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں شجرۃ! ہمارا معاشرہ اس رشتے کو ہضم نہیں کرسکتا اور یہ سچ ہے کہ تمہارے اور میرے بیچ جو ہے، وہ سب کچھ ہوسکتا ہے مگر رشتہ بہرحال نہیں۔"

وہ اپنے تئیں ہاتھ جھاڑ کر فارغ تھا۔ شجرۃ کی نگاہوں میں ہفت آسمان گھوم گئے۔

اس نے داستان بیانی کے دوران شعوری کوشش سے اسے افسانے کا عنصر نمایاں رکھا تھا کہ سنان الیاس کچھ کہہ دے۔ آگے بڑھ کر مگر۔

شعر سنانے والا... گہری باتیں کرنے والا... اتنا احمق تھا کہ سراپا اقرار بنی شجرۃ کو جواب نہ دے پاتا تھا۔ وہ کیوں اتنا بے خبر نظر آتا تھا۔

"دنیا واقعی اپنی آنکھ سے اپنی پسند کا منظر خود سے گھڑ کر دیکھتی ہے۔" سنان کی خود کلامی۔

ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے۔
اب اس کی مرضی کہ وہ خزاں کو بہار لکھ دے۔
بہار کو انتظار لکھ دے۔
ہوا کی مرضی کہ وصل موسم میں ہجر کو حصہ دار لکھ دے۔
محبتوں میں گزرنے والی رتوں کو ناپائیدار لکھ دے۔
شجر کو کم سایہ دار لکھ دے۔ ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے۔
ہوا کو لکھنا سکھانے والو!
ہوا کو لکھنا جو آگیا ہے۔"

"کیا تمہیں مجھے یہی جواب دینا چاہیے تھا سنان؟" شجرہ نے پلکیں جھپکیں وہ چیخ کر اس کا گریبان تھام کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کہے۔ اور وہ شعر پڑھ رہا تھا۔

دونوں ٹوٹے تنے پر بیٹھے تھے اور وہ شہادت کی انگلی سے تنے کی کھردری سطح کو مس کر رہا تھا۔ جواب نہ دیا بس نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

شجرۃ کا دل پھٹ جانے کی حد تک پھیلا۔ اتنا احمق وہ کم از کم نہیں تھا۔ اس نے سیدھے سادھے جملوں کے بیچ۔ یونہی ہنستے گزرتے راستوں میں کبھی لپیٹ کر... کبھی گھما پھرا کے... کئی بار اپنے جذبے عیاں کرنے کی کوشش کی تھی۔ زبان سے کہا تھا، ذو معنی انداز میں... بے وقوفی کی تھی... آنکھوں سے اس کا سارا اندر عیاں ہوتا تھا۔ پھر اس بے نیازی کی وجہ۔ لاپروائی کا کارن؟

وہ اتنی جرات مند تھی کہ صاف اپنے منہ سے کہہ دیتی کہ۔

لیکن یک دم اس کے اندر کا عورت پن عود کر آیا۔ وہ اب لفظ بھی نہ کہے گی... وہ سرعت سے اپنا بیگ اور فائلز سمیٹ کر تنے سے اچھل کر کود ی۔

"ارے۔ کہاں جا رہی ہو؟" سنان بری طرح چونکا۔ کلاس میں تو ابھی بہت وقت تھا۔

"جا رہی ہوں۔" اس نے اپنی آواز کی ساری سلوٹیں دور کرکے کہا۔ "تمہیں چھوڑ کر۔ یہی کہا ہے ناں میرے بھائی نے۔ اور۔ اور تم نے تائید کی ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"یوں۔ ایسے... ایک دم... اچانک۔" وہ بھی اب اچھل کر تنے سے اترا۔

"ہاں، جب فیصلہ کرلیا تو دیر کیسی۔ ابھی یا کبھی۔ خدا حافظ۔" وہ کئی قدم آگے بڑھی۔

"ابھی تو۔ یار! لنچ تو کرلیں۔" وہ بھاگ کر آیا تھا۔

"کیوں؟ کیسا لنچ؟ جب طے کرچکے تو کرچکے۔ ابھی اور اسی وقت دی اینڈ۔" اس نے دل برف کی سل ٹھہرادی تھی۔ آگ آنکھوں کے راستے نکلنے لگی؟ آہ۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مگر میں نے یہی سمجھا۔" وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں بہتی ہیں تو بہتی رہیں... وہ ڈٹی رہے گی۔

"میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا شجرۃ!" وہ شکست خوردہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ایسی کیا کمی ہے کہ تم خود کو۔ میرے۔ قابل نہیں سمجھتے۔؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"تم نے شاید کبھی مجھے غور سے دیکھا نہیں۔" اس نے کہا اور پھر اس کے بدستور سوالیہ چہرے کو دیکھ کر خاموشی سے اپنی ٹانگ سامنے کردی۔

اس کی نظروں کے تعاقب میں شجرۃ نے ٹانگ کو دیکھا۔ وہ پل بھر میں اس کے دل کا سارا بھید جان گئی۔ اس کی ہچکچاہٹ، امر مانع سنان الیاس کی آنکھوں میں جذبے بولنے لگے تھے۔ جن سے وہ خود کو کترا تا رہا تھا۔

وہ لمحہ فیض تو یاد نہیں جب دل نے دھڑکن کی لے

بدلی۔ مگر دنیا یکدم اچھی لگنے لگے تو۔

"میں نے واقعی تمہیں غور سے نہیں دیکھا۔" شجرۃ کی آواز گھٹنے سی لگی۔ "مگر اس لیے کہ وہاں تک نگاہ کبھی گئی ہی نہیں۔" شجرۃ کا لہجہ ہچکچاہٹ کے سارے پردے چیرتا اب بے حجاب کھڑا تھا۔

اس نے صاف گوئی کی حد کردی تھی۔

"تو تمہیں میرے ساتھ چلتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟" فیصلے کی راہ پر چلتے ہوئے اس نے بھی راست گوئی کو اپنایا۔ وہ خیال جو اس کی راہ میں حائل ہوجاتا تھا۔

اظہار کی راہ میں۔

اقرار کی راہ میں۔

اس محبت کی راہ میں جو ہر روز سنان الیاس کے دل میں شجرۃ الدر کے لیے امنڈ امنڈ کر آتی تھی۔

"شرم!" شجرۃ کا سوال حیرت میں گندھا ہوا تھا۔

"کیسی شرم؟"

"یہی کہ دولہن کے ساتھ ریسپشن پر آتا دولہا تھری پیس پہن کر چلتا ہوا یوں لگے جیسے لنگڑی پالا کھیلتا آرہا ہو۔ یا سب کے بھنگڑے ختم ہوجائیں مگر وہ پھر بھی بھنگڑے کرتا ہی نظر آئے۔ لوگ پوچھیں کہ آخر دولہا کب تک بیٹھے گا۔ جواب آئے جی دولہا تو آرام ہی سے ہے۔ شرمیلا ہی بہت ہے۔ اس نے کیا خاک بھنگڑا ڈالنا ہے۔ دراصل دولہا کی چال ہی ایسی ہے کہ ہر وقت حالت بھنگڑا ہی میں ہوتا ہے۔ لنگڑا ہے ناں ایک ٹانگ سے۔"

سنان الیاس کو حرف حرف ازبر تھا۔ کبھی بھولا ہی نہیں۔ شجرۃ کی طرف مائل ہوتے دل کی راہ میں حائل یہی تو وہ دل چیر دینے والے جملے تھے۔ جو آگے بڑھنے سے روکتے تھے۔ ورنہ شجرۃ کی آنکھوں سے چھلکنے والے جذبے تو بہت پہلے سمجھ میں آنے لگے تھے۔

شجرۃ کا چہرہ اچنبھے کی تصویر بن گیا۔

"یہ کیسی باتیں کررہے ہو تم۔ کون کہے گا ایسے؟ اتنی گندی بات۔ گھٹیا بات کیوں کہے گا؟" سنان کے جملے جیسے ذہن میں بازگشت کرنے لگے۔ اس کا رواں رواں کھڑا ہونے لگا۔

"لوگ کیا کہیں گے۔ دنیا۔"

"بھاڑ میں گئی دنیا۔ میں نہیں کرتی پروا کسی کی بھی باتوں۔ اور اندازوں کی۔ میں ہمیشہ اپنے طے شدہ راستے پر چلی ہوں۔" وہ بھڑکی۔ "اور تم نے اتنی عجیب بات سوچی بھی کیسے؟" اسے یاد آیا۔

"میں نے نہیں سوچی۔ مجھے بتائی گئی۔"

"کس نے۔ کس نے بتائی؟" اس کا لہجہ جارحانہ ہوگیا۔ بس ایک بار پتا لگے تو وہ ایسی کی تیسی کر آئے۔

"نرمین نے۔"

"کون نرمین؟"

"نرمین جو میری منگیتر ہونے والی تھی۔ مگر پھر ایکسیڈنٹ کے بعد اس نے یہ جملے کہہ کر ایکسکیوز کرلیا۔"

شجرۃ سناٹے میں رہ گئی۔

"اس نے ان جملوں کو ایکسکیوز کے لیے استعمال کیا تھا۔ ہاہ۔" حیرت اور دکھ کی بنا پر اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ سنان نے جواب نہ دیا۔ وہ اپنی لنگ والی ٹانگ کو بے پروائی سے ہلا رہا تھا۔

"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا سنان!" وہ اس کی ٹانگ کو دیکھنے لگی۔ "جب میں انجان تھی تب بھی اور جب کہ میں جان گئی۔" اس کے جملے میں اس کا حال دل تھا۔ "اور نہ کبھی دیکھوں گی۔" جملے میں عہد بھی تھا۔

سنان نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ ڈٹ گئی تھی اپنے کہے پر۔ جان گئی تھی اس کے گریز کا کارن۔ دکھی ہوئی تھی۔ لیکن اب جواب کی بھی منتظر تھی۔ ایک خاموش پل۔ ہاں اور ناں کا فیصلہ۔ گھڑی پر دیکھتے تو شاید چند منٹ ہی آگے سرکے ہوں۔ مگر شجرۃ کو لگا۔

پہاڑوں پر صدیوں سے جمی برف پگھل کر دریاؤں سے ہوتی سمندر میں گرنے لگی ہے۔ انتظار کا پل اتنا ہی طویل لگتا ہے۔ وہ ہانپنے لگی تھی اور شاید ہارنے بھی۔

سچ تھا ٹانگ میں لنگ آگیا تھا۔ مگر وہ بے حد معمولی تھا اور ذرا غور کرنے پر ہی دکھائی پڑتا تھا۔ مگر اس معمولی سی خامی نے لوگوں کے دلوں کی بڑی بڑی خامیوں کو آشکار کردیا تھا۔

نرمین کے ہنسی سے بھرپور لہجے میں کہے گئے جملے۔ اس کی آنکھوں میں اپنی ہی بات کا مزہ لیتا وہ تاثر سنان کو بھولا تو نہیں تھا۔

ماں اور بہنوں کے خدشات پر وہ چونکا تھا "اگر ٹانگ میں نقص رہ گیا تو؟"

"تو کیا ہوا وہ زندہ تو ہے ناں؟"

لیکن نرمین کے جملوں کے بعد پیچھے ہٹ جانے والے اور دوسرے۔ جو پہلے اس پر نثار ہوتے تھے۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے دو ہی جذبے رہ گئے تھے۔ ترحم یا کترانا پھر وہ بھی پیچھے ہٹ کر اپنی دنیا میں کھو گیا۔ وہ اپنا اعتماد کھوچکا تھا۔ ایسے میں شجرۃ کا بھری کلاس میں سر سے کہنا کہ وہ کتاب افورڈ نہیں کرسکتی۔ اس کے اعتماد نے اسے متوجہ کیا تھا۔ اس کی محنت نے 'ہار نہ ماننے' کی فطرت نے اسے اس کی جانب مائل کیا تھا اور توجہ بڑھ کر نئے جذبے میں ڈھلنے لگی تو وہ خود کو جبراً" باز رکھنے لگا۔

لیکن۔ آج۔۔۔ ابھی جب وہ سوال لیے کھڑی تھی۔ زندگی میں اب تک ایسا مشکل مرحلہ پہلے کبھی نہ پڑا تھا۔

وہ متوقع نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دنیا سے نہ ڈرنے کا دعوا کرتی تھی مگر دنیا کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے اس کی ہاں چاہتی تھی۔

"میں نے یقین کرلیا۔ تم آئندہ بھی اسے (لنگ کو) نہیں دیکھو گی۔" اس نے کہہ دیا۔

بہت مشکل چیزیں۔ اتنی آسان بھی ہوجاتی ہیں کبھی کبھار۔

☆ ☆ ☆

آفاق کی جانے انجانے میں بھڑکائی جانے والی آگ جو سب خاکستر کردینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ مگر جیسے کسی معجزے سے ٹھنڈی ہوگئی انگارے پھولوں میں بدل گئے۔ جس پر وہ ہاتھ تھامے اب زندگی بھر چلنے والے تھے۔

متوسط آمدنی۔ متوسط گھرانہ۔ متوسط ماحول۔ اس بے حد درمیانی طرز زندگی کے حامل لوگوں کے بیچ شجرۃ الدر کچھ الگ تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال بھی یہاں کسی سے نہیں ملتے تھے۔ اس کی عادات واطوار بھی۔ زندگی گزارنے کا طریقہ بھی اور اس کے مستقبل کی یہ دھندلی شکل۔

طبقاتی تقسیم کے لحاظ سے ان دو گھرانوں کا آپس میں کچھ میل نہ تھا۔ مگر جب کچھ چیزیں قدرت طے کردے تو۔۔۔ لیکن لگانے والوں نے کئی اندازے اور قیافے لگائے تھے جس میں سے کچھ درست تھے اور کچھ غلط۔ اصل بات۔

سنان کی والدہ بہت بوڑھی تھیں۔ سب اولادوں کو بیاہنے کے بعد وہ سنان کے حوالے سے ۔۔۔ فکرمند تھیں۔ معاشی مسائل نہیں تھے۔ سب اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اپنا کاروبار کررہے تھے۔ تعلیمی لحاظ سے بھی نام تھا۔ میاں مرتے وقت جائیداد کی منصفانہ تقسیم کرگئے تھے۔ ایک سراسر بے فکری کے ماحول میں سنان کا ایکسیڈنٹ اور پھر سرسری نگاہ کی وہ انتہائی معمولی معذوری جوان کے نزدیک جان بچ جانے کا شکرانہ تھی۔ لوگوں کی نظر میں طعنہ بن جائے گی۔ یہ تو سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

نرمین کے انکار اور بے حد بدتمیز جملوں کو بھلا کر جب وہ دوسرے طالب گاروں کی جانب بڑھیں۔ جو پہلے ہاتھ ملتے دکھائی دیتے تھے۔ اب نرمین سے زیادہ طوطا چشم ثابت ہوئے۔

وہ صدمے سے زیادہ حیرت کی تصویر بن گئیں۔

باقی کی آٹھ اولادیں اپنی گھر بار کی تھیں۔ وہ ان کی پریشانی کے جواب میں بڑے متوکل بنے تسلی دیتے۔ "اللہ مالک ہے۔" مگر خود سے ہاتھ چلانے کا وقت بھی نہ تھا اور نہ ہی شوق جذبہ یا فکر۔ ماں کی تابعداری بھی نہیں تھی۔ اس حوالے سے کہ ان کا بوجھ بانٹنے کو لڑکی

www.paksociety.com

تلاش کرنے نکل پڑتے۔ سنان ابھی شادی کے لحاظ سے کم عمر تھا۔ مگر مسز الیاس کو ایک چنتا سی لگ گئی۔ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ معمولی سی لڑکھڑاہٹ پوری زندگی کو ڈھا دے گی؟

وہ صبح شام فکر مندی کی چادر اوڑھے رہتی تھیں۔ سنان کی خاموشی۔ نرمین کی بے ہودہ گوئی کے بعد کا سنان۔ "ہوں۔ ہاں۔ جی۔ اچھا۔" وہ ایسا تو نہیں تھا۔

اور کیا یہ ایسے ہی رہ جائے گا۔ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن بہن بھائی۔

گھر میں وہ دونوں ماں بیٹا رہتے تھے تو اتنی خاموشی۔ اور جب کل کو وہ بھی نہ ہوں گی تو اکیلا۔ خاموش سنان۔ نہیں نہیں نہیں۔

انہیں شجرۃ الدر میں کوئی برائی نظر ہی نہ آئی۔ کچھ بھی قابل اعتراض نہ لگا۔ وہ چار بیٹے بیاہ کر سارے ارمان نکال چکی تھیں۔

انہیں شجرۃ کی آنکھیں پسند آئیں۔ (سنان کی تصویر سے بجی۔)

مسکراہٹ نے دل موہ لیا۔ (سنان کے نام پر چہرے پر کوندا سا لپکتا تھا)

تعلیمی قابلیت اور مستقبل کی شکل بھی اچھی لگی۔ بہو کمتر نہیں تھی۔ استاد باپ کی بیٹی۔ محسنہ اور دونوں ماموؤں کی عاجزی اور شرافت نے بھی دل کو بڑا کیا۔ وہ سب بھی سنان کا چہرہ اور دل دیکھ رہے تھے۔ ان سب لوگوں سے بہت اچھے جو ان کے اپنے خونی رشتے تھے اور سنان کی چال دیکھتے تھے اونہہ۔

ادھر شجرۃ کے گھر میں۔۔۔ ایک حیرت آمیز خوشی تھی۔

وہ سب سے الگ دکھتی تھی۔۔۔ الگ رہتی تھی۔۔۔ الگ دنیا۔۔۔ مگن مطمئن۔

مازیہ نے خوشی سے سنا تھا۔ وہ دونوں بمشکل میٹرک تھیں۔ ایک کا شوہر سیلز مین تھا۔ غازیہ کا ورکشاپ چلاتا تھا۔ پڑھا لکھا سنان۔۔۔ مسز الیاس جیسی ساس شجرۃ کی دو نندیں امریکہ میں تھیں ایک جیٹھ اسلام آباد میں اچھے عہدے پر تھے۔

سب اتنا دھیما بولتے تھے۔ نزاکت سے ہنستے تھے اور وہ کسی بھی تفریق کے بغیر بہت نارمل رویے سے سب سے ملے تھے۔

"شجرۃ کے لیے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔" ماموؤں نے سوچا۔

آفاق کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ اشفاق خوش ہو گیا وہ اب دوست کو کہہ دے گا۔ وہ اس کا بہنوئی ہے۔

بات طے ہونا منگنی کے خیال میں ڈھلا تھا۔ تب نازیہ نے اسے اپنے تئیں چھیڑا۔

"منگنی پر خوش نہ ہو شجرۃ! پتا ہے ناں ہمارے ہاں منگیتر سے کیسا پردہ کرواتے ہیں۔ چھپا دیتے ہیں۔ جیسے گناہ ہو۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔

شجرۃ کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں۔

"ہم تو ساتھ پڑھتے ہیں اور شادی تک پڑھتے ہی رہیں گے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"پڑھتے رہنا۔ مگر ابو جی بھی ایڈمیشن لے لیں گے اور تم دونوں کے درمیان والی کرسی پر بیٹھیں گے۔ ہی ہی۔" اسے گدگدیاں ہو رہی تھیں۔

"نہیں۔!" شجو کو تصور نے ٹھٹھرا دیا۔

اس نے سنان کے آگے ساری صورت حال رکھ دی۔

"یار! تمہارے گھر والے پاگل ہیں۔" وہ بھنا گیا۔

"یہ وہ والی نسل تو نہیں ہے ناں، جو میاں سے بھی پردہ کرتی ہے۔ نام تک نہیں لیتی۔ اے جی وہ جی کہہ کر زندگی گزار دیتی ہے۔ ایک لطیفہ سناؤں؟

ایک عورت نے زندگی بھر مکھن کو مکھن نہ کہا کہ سرتاج کا نام مکھن سنگھ تھا۔ بے ادبی ہوتی نا کہنی مکھن دے دو۔ مکھن کھانا ہے۔۔۔ کہیں یہ مکھن سنگھ تمہارے دادے پردادے میں سے تو نہیں تھے؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

شجرۃ بُرا مانے بغیر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ہنسو نہیں۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ رواج ہوتے ہیں اور لوگ ان سے سرکنا گناہ سمجھتے ہیں۔"

"کچھ نہ کرو۔ میں صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔"

"پھر تو یہ مزے کی بات ہو گئی۔" اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ "ہم چھپ چھپ کر ملیں گے۔"

"تم اور چھپ کر ملنے والے۔" شجرۃ کو مزہ آگیا۔ (وہ ہمت والا کہ چھپ کر ملنے آئے گا۔ اظہار تک تو کیا نہیں۔ بس مجبوراً "حالات نے ایسی کروٹ لی تو یہاں تک پہنچ گئے)

"مطلب! کیا میں چھپ کر نہیں مل سکتا؟"

"تمہاری چھپ چھپ کر ملنے والی شکل ہی نہیں ہے۔" وہ اسے چڑا رہی تھی۔

"تم مجھے جانتی ہی نہیں ہو۔ سنان الیاس فل پیکج ہے سرورق پر مت جاؤ۔ کچھ ورق پلٹ کر دیکھو۔" اس کا لہجہ ہی نہیں آنکھیں بھی بدلی تھیں۔

شجو کسمسا گئی۔ "کیسی باتیں کر رہے ہو۔ سیدھی طرح دیکھو۔"

"بس۔۔۔ اتنی سی ہمت۔" اس نے نظروں میں مزید گھور کر اسے دیکھا۔

"چلو جاؤ۔ جانے دیا۔" اسے ایک گہرا غوطہ دے کر جیسے پل بھر میں کھینچ لیا تھا۔

"تم مجھے جانتی نہیں ہو شجرۃ الدر!" اس کا لہجہ کانوں سے نہیں دل سے سننے والا تھا۔ شجرۃ کو واقعی وہ کچھ اور لگا۔ نیا نیا سا۔ اجنبی۔ مگر بہت اچھا۔

مسز الیاس کے فون نے سب کو حیرت انگیز مسرت میں مبتلا کر دیا۔

"زندگی کا کیا بھروسا۔ وہ بیمار رہتی ہیں۔ منگنی نہیں کریں گی۔ نکاح ہو گا دھوم دھام سے۔ رخصتی پڑھائی کے بعد۔"



زندگی کا نیا رنگ۔

اس نے بہت بچپن میں زندگی کی ترجیحات طے کر لی تھیں سمت سیدھا ستھرا راستہ۔ پڑھنا اور ابو کی طرح ٹیچر بننا۔ خود مختار ہونا۔ پھر سنان الیاس نے بتایا۔ پڑھائی کی کوئی حد نہیں اور خود مختاری کی سو شکلیں۔

شادی۔ آبادی۔ نئے رشتے۔۔۔ وہ اس پہلو پر تو کبھی گئی ہی نہیں۔ سب کی شادیاں ہوتی ہیں۔ اس کی بھی ہو جائے گی۔ بس۔ مگر زندگی کا یہ مرحلہ سب سے پہلے آئے گا اور وہ بھی اتنی خوب صورتی سے۔ سنان الیاس کی صورت۔ اور سنان الیاس۔ گھنا میسنا یا منافق۔ نہیں نہیں منافق تو نہیں۔ بس وہ انسان جو اچانک چپ کر گیا تھا۔ دنیا کی آنکھ نے اسے دکھ دیا تھا اور زبان نے چیر دیا تھا۔ وہ کتنا خاموش اور ہلکا سا لگتا تھا۔ دیکھنے میں ایک عام سا نوجوان۔ وہ کتنا بولنے والا نکلا اور کتنا گہرا اور۔ اور۔

بے رنگ زندگی میں آنے والے رنگ۔

خوشی اور ہنسی بے یقینی۔ وہ کتنی ہی بار شہادت کی پور دانت میں داب کر یقین لیتی۔ حقیقت ہی ہے ناں۔ خواب تو نہیں۔

وہ راستہ۔ چوراہے۔ گلیاں لوگ مگر۔ مگر۔

"یہ پہاڑی کتنی پیاری لگتی ہے ناں جیسے مری میں ہوں۔" (یونیورسٹی کے اندر موجود پہاڑی تو ہمیشہ سے یہیں تھی۔ اسے اب نظر آنے لگی تھی)

"تم جو ساتھ ہو۔" سنان دریا کو کوزے میں بند کر دیتا۔

"مجھے نہیں پتا تھا گل دوپہری کے اتنے بہت سارے رنگ ہوتے ہیں۔" (مین گیٹ سے اردو ڈپارٹمنٹ کے موڑ تک دو رویہ سڑک کے درمیان لمبی کیاری میں گل دوپہری کے تمام رنگ شروع ہی سے تھے اس کی بینائی گویا اب لوٹی تھی)

"میں جو ساتھ ہوں۔" سنان کے چند حرفی جواب میں کوئی کسر نہ تھی۔

"اب اس راستے پر چلتے ہوئے میں تھکتی نہیں سنان۔"

"ہم اکٹھے ہو کر جو چلتے ہیں۔"

"اور یہ جو۔" اسے کوئی نئی بات یاد آئی۔

"ارے سنو۔" سنان یکدم رکا۔ اس کے عین

سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کے شانے پر دونوں ہاتھ جمادیے۔

"سب کچھ وہی ہے۔ وہیں ہے۔ مگر ہم نئے ہوگئے ہیں۔ محبت میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ سب خوب صورتی منظر میں نہیں نظر میں ہے۔ محبت میں ہے۔ ہاں محبت۔ وہ جو تمہیں مجھ سے اور مجھے تم سے ہو رہی ہے۔ ایک دوسرے سے ہوگئی ہے۔"

"محبت۔" شجرہ نے ہولے سے دہرایا۔

"ہاں محبت!" اس نے یقین کی مہر ثبت کردی تھی۔

☼ ☼ ☼

رہٹ کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی باندھے گردوپیش سے ناآشنا گھومتے رہنے والی شجرۃ الدر۔ لائبریری میں بند ہونٹوں کے ساتھ ٹھنڈا پراٹھا چباتی شجرۃ الدر۔

کسی سنگی ساتھی کے بغیر چپ چاپ دوسروں کو دیکھنے اور سننے والی خود کلامی کرتی۔ تنہا اور گم صم نظر آتی شجرۃ الدر۔

جیسے کسی نادیدہ چادر میں چھپی تھی۔ سنان الیاس کے ساتھ نے اس چادر کو دور کہیں ہوا میں اڑا دیا۔ شجرۃ الدر واضح ہو کر سامنے آگئی۔

اسے ہنسنا بھی آتا تھا اور بولنا بھی۔ قہقہے لگانا بھی۔ دوسرے تو کیا وہ خود اپنے اس نئے روپ کو دیکھ کر حیران تھی۔

اس کی زندگی میں اچانک ایک رشتہ آگیا تھا۔ ایسا رشتہ جو اس جہان فانی کی بنیاد ہوتا ہے۔ جو نازک ہوتا ہے۔ بلبلے کی طرح اور مضبوط۔ پہاڑ کی طرح۔

معاشرتی لحاظ سے ان کا تعلق ابھی کچھ حدود کا پابند تھا لیکن مذہبی حوالے سے ہر شے کی چھوٹ۔۔۔ نکاح کے بعد کسی چیز کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

وہ اکٹھے آتے جاتے۔ کھاتے پیتے پڑھتے۔ گھڑی کی ٹک ٹک پر نگاہ کیے بغیر مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے۔

محبت کے لیے سب سے اہم نسخہ تھا نکاح سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ کر محسوس ہوتی تھی پسندیدگی تھی۔ دوستی۔ کشش۔ اب جو ہوئی تھی محبت تھی۔ محبت بے حد بے۔ پناہ۔ ہر روز بڑھتی ہوئی۔

وہ اس رشتے کا جی بھر کے لطف اٹھا رہے تھے۔

وہ سنان الیاس کے ہم قدم ساحل کی ریت پر چلتی دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو کو جکڑ کر شانے پر سر رکھے ہوا سے اڑتے بالوں سے بے پروا۔

وہ اسے شعر سناتا۔ نظمیں۔ غزلیں۔ وہ آنکھیں موندے سنتی۔

اس کی تشخیص میں شاید مرض آجائے
جنوں کی ساری علامتیں بھی لکھ دوں گا
بڑا کٹھن ہے نثر میں حال دل لکھنا
بہ صورت غزل دل کی حکایتیں لکھ دوں گا

اپنی کہانی کیا پوچھتے ہو کتنی اچھی کتنی پیاری
ہم نے جسے چاہا تھا ہم نے اسے اپنایا بھی

میری زبان وہ قطعاً "سمجھ نہیں پاتے
اور ان کی اپنی تو کوئی زبان ہے ہی نہیں

کبھی کبھار وہ یکدم چپ کر جاتا۔ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیتا۔

"کچھ سمجھ میں آیا؟" وہ ہونٹ کا کونا دانت میں دباتی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتی۔ جو کڑے تیوروں سے مشکوک ہوتا۔ وہ نفی میں سر ہلاتی۔ (کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہوتا) شریر مسکراہٹ کے ہمراہ۔

"تو پھر سن کر جھومتی کیوں ہو؟" وہ خفا ہونے لگتا۔

"تمہیں سننا اچھا لگتا ہے۔"

"اور شاعر کی صلاحیت؟"

"بھاڑ میں گئی۔ مجھے تو بس تمہاری آواز سے تمہارے لہجے سے غرض ہے۔"

"یہ جانے بغیر میں کیا کہہ رہا ہوں۔" حیرت کی زیادتی سے وہ چلا اٹھا۔

"ہوں ہوں۔ مجھے پتا ہے۔ تم محبت کے علاوہ کچھ نہیں کہتے۔" اس کا یقین اسے بھونچکا کر دیتا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں محبت کہہ رہا ہوتا ہوں۔ کیسے؟"

"تمہارا لہجہ بتاتا ہے۔ آواز اور آنکھیں۔" وہ اس کی ناک کو شرارت سے پکڑ لیتی۔

"اتنا یقین شجرہ۔" وہ سب بھول جاتا۔ "کب سے؟"

"ہمیشہ سے۔" وہ دوبارہ شانہ دبوچ کر قدم بڑھانے لگتی۔

پوری آب و تاب سے چمکتا جاگتا سورج۔ نیند سے بڑھال ہو جاتا اس کی آنکھ میں سرخی آجاتی مگر آنکھیں موندنے کی حد تک۔ وہ ان دونوں کو دیکھتا رہتا۔

دن بدن بڑھتا میل جول۔ دونوں پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ تھے۔

"تم سی ایس ایس کا امتحان کیوں نہیں دیتیں شجرہ؟" اس نے آنرز میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔

"وہ تو بہت امیر لوگ دیتے ہیں۔"

"بے وقوف! وہ بہت ذہین لوگ دیتے ہیں۔"

"میں اتنی ذہین ہوں؟"

"محنتی زیادہ ہو۔"

"اور پھر کیا بنوں گی؟ افسر؟"

"تو اور کیا۔"

"تو پھر تم بھی دے لو۔ تم کیا کرو گے؟"

"تمہاری چاکری۔ جی حضوری۔ میڈم!" وہ مودب بحالت رکوع میں چلا جاتا۔ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنس پڑتے۔

نکاح نے انہیں دیکھنے کی چھونے کی اجازت دے دی تھی۔ اللہ کے نزدیک کوئی حد نہ تھی۔ (مگر معاشرے کا مقرر کردہ وقت ابھی دور تھا۔ بہت دور)

اس نے سنان الیاس سے نکاح کیا تھا اور پھر محبت کی تھی بہت زیادہ۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔ اور آنکھیں۔

اس نے کبھی اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ کو نہیں دیکھا تھا کہ محبت عیب پوش ہوتی ہے۔ اور وہی دیکھتی ہے جو دیکھنا چاہیے یعنی دل۔ محبت سے لبریز دل۔

وہ ساتھ چلتے بہت پیارے لگتے تھے۔

وہ دراز قد تھا اور نمایاں تھا۔ اس کی اداس بناوٹ والی آنکھوں میں ہنسی کا مستقل ڈیرا۔ دھوپ چھاؤں کا منظر تھا جیسے۔

دنیا انہیں دیکھتی تھی۔ رشک سے۔۔۔ حسد سے۔۔۔ حیرت سے۔۔۔ شک کے بغیر۔ واہ۔

لیکن کوئی تھا جو انہیں تلملا کر دیکھتا تھا۔ جلبلا کر۔ گھور کر۔ وہ جو ان کی تاک میں تھا۔ حالانکہ موقع گنوا چکا تھا۔

مگر اسے موقع پیدا کرنے آتے تھے۔ وہ دونوں تو بہت آسان شکار لگے تھے۔

وہ بہترین منصوبہ ساز تھا۔ اور اس کا نام۔

☼ ☼ ☼

وہ شروع دن سے ان دونوں کے ساتھ تھا۔ گونگا نادیدہ بن کر بس ایک پہرے دار کی طرح اور اس دن بھی جب سنان الیاس نے شجرۃ الدر کو پکارا تھا۔ اور اپنی کتابیں دے دی تھیں کہ وہ پڑھے اور سہولت سے واپس کردے۔

پھر جب دونوں ریڑھیوں پر کتابیں ڈھونڈ رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ تعلق بن رہا تھا۔ ناتا جڑ رہا تھا۔۔۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہو رہے تھے۔

وہ تب بھی وہیں موجود تھا۔ دونوں کی دوستی کا رشتہ اچانک تھا اور بے ضرر تھا۔

کلاس روم میں وہ کہیں ادھر ادھر بیٹھتے تھے۔ پھر ساتھ ساتھ کرسیاں جوڑنے لگے۔ وہ دونوں کے درمیان میں تو نہ گھس کر بیٹھ سکا۔ ہاں کسی نہ کسی درز یا کونے کھدرے سے انہیں دیکھتا ضرور رہتا۔

وہ دونوں کم عمر تھے۔ کم عقل اور کم علم بھی تھے۔ نہ دنیا کے علم سے واقف تھے نہ دین کے علم سے۔

معاشرتی حدود و قوانین کی بھی اتنی سمجھ نہ تھی۔ ہاں اس یقین سے ضرور جیتے تھے کہ جو ہم کررہے ہیں۔ وہ درست ہے اور کسی کو روکنے ٹوکنے کی ضرورت نہیں۔ ادھر اسے بھی کچھ جلدی نہیں تھی۔ یہ تو اس کے لیے بہت ہی آسان شکار تھے۔ ایک چٹکی کی مار۔

اس نے ان دونوں کے درمیان اپنی منصوبہ بندی رکھ لی تھی۔ بساط بچھا ڈالی تھی جس کے کسی بھی پانسے کو کھیلا جاتا۔ جیت اس کو ملتی۔

ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا اور جو تھا وہ ناجائز تھا اور گناہ تھا۔ ایسا گناہ جو مزید گناہ کی راہ کو ہموار کرتے ہوئے انت تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گیم کا باقاعدہ آغاز کرتا۔ اس کی ساری کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ دونوں یکدم ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے جو اس کرہ ارض میں اس کا سب سے ناپسندیدہ رشتہ تھا۔ اس کی روح پر تازیانے برساتا تھا۔ اسے بال نوچنے سر ٹکرانے اور سینہ کوبی پر مجبور کرتا تھا۔

ان دونوں کے نکاح نے اسے پچھاڑیں کھانے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ایسی کریہہ آواز میں روتا تھا کہ کوے اور گدھے الو اور راتوں کو رونے والے گیدڑ، کتے بھی پناہ مانگتے تھے۔ ایجاب و قبول کے وقت۔ شدت غم سے اس کا چہرہ کائنات کی سب سے بدشکل ہولناک صورت میں ڈھل گیا تھا۔

نکاح کے بعد جب ان دونوں کو ایک صوفے پر ہمراہ بٹھادیا اور سنان نے سب کی نظر بچا کر شجرۃ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے شرارتاً سختی سے پکڑ کر شجرۃ کے چہرے کے تاثرات کو جانچنے کے لیے بار بار اس کا چہرہ دیکھنے کی سعی کی۔ تب حاضرین اس کی چوری اور شرارت پر دل کھول کر ہنستے تھے۔ اس منظر کی خوب صورتی نے اس کی شکست کا اعلان کردیا۔ وہ جھکے شانوں اور بگڑی صورت کے ساتھ واپس ہوا تھا۔

لیکن۔

وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا تھا تو نہیں۔ اس نے روز ازل اللہ کے سامنے عہد کیا تھا وہ اس کے بندوں کو بہکائے گا اور ہر ممکن کوشش کرے گا۔ شجرۃ اور سنان کے معاملے میں وہ ہار گیا تھا تب ہی ایک خیال نے اس کے ڈوبتے دل کو قرار دیا۔

اسے ان دونوں کے بیچ گنجائش نظر آگئی تھی۔ بہت تھوڑی سی درز تھی کسر تھی۔ مگر اس کے لیے کافی تھی۔ بہت کافی تھی۔

نکاح اللہ کا پسندیدہ ترین تعلق ہے جو انسان جوڑتے ہیں۔

نکاح شیطان کے سینے پر پہاڑ سی سل ہے جسے توڑنے یا وجود ہی میں نہ آنے دینے کی اس نے قسم کھا رکھی ہے اسے ناجائز رشتے اور تعلق بھاتے ہیں۔

دنیا کے کسی بھی مذہب میں جب بھی انسان اس جائز تعلق کو اپنے طریقے سے جوڑتے ہیں تب وہ پچھاڑیں کھاتا ہے اور مرد و زن کے بیچ یہ رشتہ ناجائز ہو پائے تو شادیانے بجاتا ہے۔

یہ نکاح اس کے عزائم کے منہ پر طمانچہ تھا۔ وہ منہ کی کھا گیا تھا۔ وہ دونوں اب اس کے لیے قطعاً "بے کار" تھے۔ وہ کسی اور شکار کی تاک میں نکلنے کو تھا تب ہی اسے ان دونوں کے بیچ ایک راہ دکھائی دی اور۔۔۔

وہ ہارتی بازی جیت سکتا تھا' ارے اتنی سامنے کی بات دکھائی کیوں نہ دی؟ وہ شادیٔ مرگ میں گھر کر بڑے لاڈ سے اپنی سرزنش کرتے ہوئے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتا تھا۔

مذہبی لحاظ سے ایک مکمل رشتے کو بے ٹوک بنانے کو اگر۔۔۔ "خیال" "منصوبہ بندی میں گھرا تو اور واضح ہوا بڑا مزہ آیا۔۔۔ آنے لگا۔

مذہبی لحاظ سے مکمل رشتے کی راہ میں معاشرتی حد بندی حائل تھی اور معاشرے میں رہنے کے لیے معاشرے کے طے شدہ اصول و ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔

غلط تو غلط ہی ہوتا ہے۔ گناہ تو گناہ ہی ہے۔ کیا مزہ آئے اگر وہ صحیح کو' درست کو' جائز کو غلط ثابت کردے نیکی کو بدی کا لبادہ اوڑھا دے۔

اسے بدنامیاں بھاتی ہیں' رسوائیوں کا تماشا۔

عزت کے جنازے کو کندھا دینے وہ سب سے پہلے آگے بڑھتا تھا۔

ہر آفاقی دین نے اس سے پناہ مانگنے کا درس دیا ہے۔

ہر کام شروع کرنے سے پہلے اللہ کا قرب مانگتے ہیں اور اسے دھتکارا جاتا ہے پھر بھی وہ باز نہیں آتا سیندھ لگاتا ہے موقع تلاشتا ہے۔

آخر کو اس نے قسم جو کھا رکھی ہے کہ۔۔۔

ایک سجدے سے انکار کے بعد وہ سراپا نافرمانی ہے اسے فرماں برداری کسی بھی روپ میں ہو' کبھی نہیں بھائی۔

وہ شیطان مردود تھا جس نے ان کے رشتے کو تلملا کر اور جلبلا کر دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اتنی بڑی کامیابی کا احساس' نشہ' لطف' بے یقینی۔۔۔ تشکر۔۔۔

خیال کی دنیا پینگ دے رہی تھی۔ وہ ہر بار آسمان چھو کر آتی اور آسمان چھونے میں جو مزہ ہے۔ وہ تو وہی جانے جو زمین پر رہتے رہتے آسمان کو ہاتھ لگالے۔

اس نے ماسٹرز میں ٹاپ کیا۔ گولڈ میڈل لیا تھا۔ پوری یونی ورسٹی میں ٹاپ۔۔۔

پیسے بچانے کے لیے ٹھنڈا اکڑا پراٹھا کھانے والی شجرۃ الدر۔۔۔ کڑی دوپہروں میں سورج کے سامنے ڈبل پیدل مارچ کرتی شجرۃ الدر۔۔۔ ایک اعلا سول سرونٹ ہوگی یہ کسی نے تو کیا خود اس نے بھی نہ سوچا تھا اس نے تو بی اے بی ایڈ کرکے ماسٹر عبدالرحیم کی طرح ٹیچر بننا تھا۔

یہ کامیابی قسمت تھی یا محنت؟ نہیں۔۔۔ یہ دونوں باتیں ثانوی ہوجاتیں اگر سنان الیاس اس کے ہمراہ نہ ہوتا۔ اس کا رہنما' دوست' محبوب اور جیون ساتھی۔

شجرۃ کے چہرے کی کم مائیگی' افسردگی' بے زاری تو بہت عرصہ پہلے ہی غائب ہوگئی تھی۔ اس چہرے پر اب اعتماد تھا۔ خوب صورتی تھی۔ محبت تھی اور محبوب اسے محبوبیت سے تکتا تھا کہ دل بھرتا ہی نہ تھا۔

سرخ لباس میں تیز سرخ لپ اسٹک کے ہمراہ اس نے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ پھولوں کا بکے تھا۔ آج سنان گاڑی لایا تھا ویسے تو وہ اسے بائیک پر اڑائے پھرتا تھا مگر آج تو سیلبریشن کا دن تھا۔

شجرۃ ایک شان دار کینڈل لائٹ رومانٹک ڈنر کے بعد اب اپنی ساس سے ملنے جارہی تھی۔ وہ بہت بوڑھی ہوچکی تھیں اور بستر پر تھیں۔ شجرۃ نے پنک پھولوں کا ایک دوسرا بکے انہیں دیا اور خود سے جھک کر ان کے گال کا بوسہ لیا۔ انہوں نے اس کا چہرہ اپنے لاغر ہاتھوں میں تھام کر چوم لیا۔ کچھ لوگوں نے کئی بار کہا تھا۔ چھوٹی بہو بہت نچلے طبقے سے چنی گئی ہے مگر انہوں نے اس کی روشن پیشانی اور چمکتی ذہین آنکھیں دیکھ لی تھیں۔ آج وہ لڑکی کیا ہوگئی تھی۔

وہ بیٹے اور بہو کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جشن کے اس دن کے بعد کامیابی کی یہ شام جو رات کا لبادہ اوڑھنے کو تیار کھڑی تھی اور ہچکیوں سے روتی شجرۃ الدر۔۔۔ وہ سارا دن اتنا ہنسی تھی کہ تھک کر چور ہوگئی تھی۔ کبھی کبھار ہم ہنستے ہوئے بھی تھکتے ہیں اور رونے کو دل کرتا ہے۔

"یقیناً" یہ خوشی کے آنسو ہوں گے۔" وہ آخر کب تک اسے روتا دیکھتا۔

"نہیں۔۔۔ خوشی کے نہیں ہیں۔" اس نے سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"غم کے ہیں؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگا۔

"نہیں' حیرت کے۔۔۔ بے یقینی کے۔۔۔ تشکر کے۔۔۔ اور۔۔۔ اور تم سے محبت کے۔۔۔"

"اتنے نام اور آنسو؟ وضاحت دیں گی آپ مجھ کم علم کو تو خاک سمجھ میں نہ آیا۔" وہ کچھ نہ بولی۔ ناک

سکوڑی لمبا سانس لیا۔ بولنے کے لیے لب وا کیے مگر آواز حلق ہی میں گھٹ گئی تھی۔

"حیرت کہ میں یہاں تک پہنچ گئی۔ جہاں... جہاں کا میں نے کبھی خواب تک نہ دیکھا تھا۔"

بے یقینی کہ... یہ سب میں نے حاصل کرلیا۔ میں نے... جو احساس کمتری میں خاموشی سے دنیا سے کترا کر گزرا کرتی تھی۔ آج اس طرح نمایاں ہوگئی۔ اور تشکر کہ..."

وہ ہچکیوں کے درمیان ہی بول رہی تھی' یہاں پہنچ کر آواز بالکل گھٹ گئی کہ

"مجھے تم ملے سنان...! اگر آج تم نہ ہوتے تو میں... سب کچھ ہوسکتی تھی' مگر وہ نہیں جو میں ہوگئی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

سنان کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا' مگر اس کا رونا اسے تکلیف دے رہا تھا۔ وہ بس چپ کرجائے پھر بات کی جائے' مگر وہ جمعرات کی جھڑی بن گئی تھی۔ چھڑ گئی تو چھڑ گئی۔

وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ سرخ لباس سرخ لب اور سرخ آنکھیں...

"اور اور جو آنسو محبت کے تھے ان کی وضاحت نہیں کی —————— مجھے رہنما بتاتی ہو دوست' ہمدرد' ساتھی' جب بھی ہوتی ہو مشکور ہوتی ہو... محبوب کیوں نہیں بتاتیں؟ ممنون تو نظر آتی ہو۔ مبہوت کیوں نہیں... تمہیں محبت نے کبھی سحر زدہ نہیں کیا۔ اتنا سا بھی کہ چند لفظ اس کے لیے بھی..."

وہ شکوہ کررہا تھا۔ فرمائش یا اظہار۔ شجرۃ کی ہستی ہل گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور لب تھرا گئے۔

محبت... وہ تو اتنی تھی کہ وہ ساری عمر بیٹھ کر اسے لکھتی تو اختتام پذیر نہ ہوتی۔

اسے شعر کہنے نہیں آئے تھے اور اتنی طویل نثر وہ اس کی شان میں کیسے کہتی۔

آئی لو یو کہہ دے... کبھی کہا تو نہیں۔ کبھی بھی نہیں اور اگر وہ کہہ دے... نہیں۔

بہت ہلکا لگا یہ سادہ سا اظہار... تو خاص والا کیا ہوگا؟ امتحان میں جملے بنایئے والا سوال کبھی اتنا مشکل نہ لگا تھا۔ وہ شان دار اور اچھوتے جملے بناتی تھی۔ ممتحن کا دل موہ لیتی تھی۔

مگر ابھی... اتنے سالوں کے ناتے میں سنان الیاس کا پہلا شکوہ اور جائز شکوہ... اس کی آنکھوں میں شرمندگی ڈولنے لگی اور دل میں محبت جوش مارنے لگی مگر کہے کیسے... ناکامی... لیکن شجرۃ ناکامی قبول کرنے والی کب تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگی جو اسے زیر لب تبسم کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ متوقع نگاہوں سے... شرارت سے... عنقریب تھا وہ ہار کا اعلان کرتی کہ اس کے پاس الفاظ نہیں اور وہ اس قابل کہاں کہ اظہار کرسکے اس سب کا جو وہ محسوس کرتی تھی اور بتائے کہ سنان الیاس شجرۃ الدر کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔

"جانے دو... ساری ذہانت کس کام کی' جب میرے لیے تمہارے پاس چند الفاظ بھی نہیں۔"

سنان کا چہرہ بولنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ زبان بھی کہتی۔ شجرۃ جھٹکا سا کھا کر پلٹی اور... گرفت اتنی پرجوش اور اچانک تھی۔ وہ لڑکھڑا سا گیا' پہل شجرۃ کی جانب سے ہوئی تھی۔

"تم سچ کہتے ہو سنان...! میرے پاس واقعی الفاظ نہیں ہیں' تمہارے لیے کسی بھی جذبے کے اظہار کے لیے۔" سرگوشی سنان کے کان میں ابھری۔ "مگر میں..." اب وہ کچھ کہہ نہیں رہی تھی وہ اس سے اتنی قریب بھی اور... اور...

ہنوز حیران و ششدر کھڑے سنان الیاس کے لیے یہ عمل حیرت اور شدید حیرت کے بعد اب رد عمل کا خواہاں تھا جیسے...

وہ...

بہت عرصہ انتظار کیا تھا اس نے... سرخ لباس' تنہائی' جوش و ہوش کی جنگ میں آج نقب لگائی جاسکتی تھی۔



بحیثیت عورت یہ اس کی جانب سے کی جانے والی پہلی پیش قدمی تھی۔ ایسی پیش قدمی جس میں جوش' جذبہ' بے خودی' سپردگی سب کچھ موجود تھا۔ اس پر یہ موزوں ماحول... لباس' رات' خوشبو' تنہائی اور سرشاری' کامیابی اور خوشی' محبت اور احسان مندی...

ان کا رشتہ ہر عمل کی اجازت کا لائسنس تھا۔

ان دونوں کے رشتے میں تو کوئی قباحت کسر تھی ہی نہیں۔ ان دونوں کا نکاح ہوچکا تھا۔

جب دوستی تھی۔ ہم قدم چلا کرتے ہنستے بولتے تھے کسی غلطی کے بغیر پھر جب ایک ایسے رشتے میں بندھ گئے جس میں گنجائش ہی گنجائش تھی کوئی روک ٹوک نہ تھی نہ دنیا کی نگاہ میں اور اللہ کی جانب سے تو چھوٹ تھی ہی... تب بھی وہ معاشرتی حد بندی کے احترام میں اپنی حد سے آگے نہ بڑھے۔

مگر وہ حد جس کے لیے "وقت مقرر" کردیا گیا تھا اسے پار نہ کیا اور کامیابی کے جشن کی اس رات جب زبان کی پاس داری کا وہ لمحہ ہاتھ سے پھسل گیا تو دونوں حق دق تھے۔

شرمندگی تھی۔ یہ اچانک کیا ہوگیا اور کیسے ہوگیا۔ وہ بچے تو نہیں تھے۔ ذی شعور انسان تھے پہلے... اتنے سالوں میں... پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

وہ شرم سار کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ وہ نظریں چرا کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ سرشاری' شرم ساری میں بدل کر کوڑے برسا رہی تھی' جو کچھ ہوا تھا وہ قطعاً "گناہ" نہیں تھا' مگر یہ اس کا وقت بھی تو نہیں تھا۔ دنیا... ہاں دنیا بے خبر تھی' مگر اپنے آپ سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ قیامت کا پل...

واپسی کے سفر میں وہ بار بار اپنا لباس درست کررہی تھی۔ کبھی دوپٹا شانوں پر پھیلاتی۔ کبھی ماتھے پر کھینچتی' کبھی آستین کو کھینچ کر انگلیاں تک چھپانے کی سعی کرتی۔ وہ کار میں دروازے سے چپک کر درمیان سے حتی الامکان فاصلہ رکھ کے بیٹھی تھی اور مزید چپکتی تھی۔ پھر اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب آنکھیں برسنے لگیں۔

وہ رو رہی تھی زار و قطار... بے حد و حساب... اس کے رونے کی آواز میں ماتم اور بین تھے۔ وہ کوس رہی تھی خود کو یا اس کو...؟

اسٹیئرنگ پر جمے سنان کے ہاتھ یوں بھینچ گئے کہ ایک ایک رگ نمایاں ہوگئی۔ وہ اسے رونے سے باز رکھنے کے لیے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ الفاظ شرمندگی کے... کچھ جملے معذرت کے... اور... اور کچھ پیراگراف یہ کہ... کوئی بات نہیں۔ کوئی گناہ تو نہیں ہوا سب عین شریعت اور عین فطرت...

غین غلط کی کوئی حیثیت نہیں اور پھر جب اس کا رونا بڑھتا ہی گیا تو اس نے کہہ بھی دیا۔

وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ آفٹر آل میاں بیوی ہیں' کوئی گناہ نہیں کر بیٹھے کہ ضمیر ملامت کرے اور دنیا ذلیل... وہ سن رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ اور سنان الیاس کو قائل کرنا آتا تھا اور شجرۃ الدر کو اسے سمجھنا ہمیشہ آسان لگا تھا۔ سو گھر کے پاس اترنے تک وہ خود کو نارمل کرچکی تھی۔

اسے بچپن سے خود کو کمپوز کرنا آتا تھا۔ حال دل چھپا کر مسکرانا۔ اپنے قدموں کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پا کر وہ سب گھر والوں کے بیچ بیٹھی ہنس رہی تھی۔ سب کو سن رہی تھی۔

"یعنی کہ اب میں شادی کی تیاریاں شروع کردوں؟" امی نے سب حاضرین کو اطلاع دی اور پوچھ بھی لیا۔

"بالکل... ہاں... ہاں..." کچھ دل کھول کر مسکرائے' کچھ نے زور و شور سے سراہا۔ شجرۃ کے مسکراتے لب بھینچ گئے۔ اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

"کس... کس کی شادی؟"

"تمہاری اور کس کی؟"

"ایسے ایک دم کیوں؟"

"ایک دم کا کیا مطلب؟ یہی طے ہوا تھا نا کہ شادی پڑھائی کے بعد... تو وہ ہوگئی مکمل۔" محسنہ نے اپنی گود

میں بڑا گولڈ میڈل لٹکا کر دکھایا۔
شجرہ کے لبوں سے سرد آہ سی نکل گئی سب محسنہ کے حامی تھے۔
"آپ کے خیال میں میں نے اس دس گرام کے سونے کے ٹکڑے کو پانے کے لیے اتنے سال دن رات ایک کیے ہیں۔"
سب کے منہ کھل گئے۔ یہ سونے کا ٹکڑا تھا۔
شجرہ نے سب کے سوالیہ چہروں پر نگاہ دوڑائی۔
"اصل امتحان تو اب شروع ہوگا۔ سارے سال کی محنت پر پانی پھر جائے گا اگر خدانخواستہ آگے ایک پل کو بھی ناکام ہوئی تو۔۔۔"
"یعنی اب آگے اور پڑھنا ہے؟ مگر کیا۔۔۔ اب کون سا امتحان باقی ہے؟" الگ الگ سوال عجلت سے پوچھے گئے تھے۔
"مقابلے کا امتحان اسی۔۔۔ مجھے مقابلے کا امتحان دینا ہے۔"
سب کے منہ کھلے رہ گئے۔ یہ کون سے امتحان کا نام تھا؟

☆ ☆ ☆

وہ بے چین تھی۔ کس کروٹ سکون نہ تھا۔ اس کی روح بے قرار تھی۔ ہانپتی تھی۔ کانپتی تھی۔ وہ شرمسار تھی۔ کبھی غصہ ہو جاتی۔
اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ سارا الزام سنان پر نہیں رکھ سکتی تھی وہ اکیلا تو شریک کار نہیں تھا۔ تالی کبھی ایک ہاتھ سے بجتی ہے۔ دونوں سالوں سے ساتھ تھے اور اس رشتے کو بندھے بھی عرصہ گزرا۔
پھر آج یہ کیا ہو گیا تھا۔
اس کے رونے پر وہ تسلیاں دے رہا تھا اور صبح دے رہا تھا۔
کوئی گناہ تو نہیں ہو گیا تھا۔
"ہاں واقعی گناہ تو نہیں ہو گیا تھا۔" وہ اس پہر اب خود کو دوبارہ سے دلاسے دے رہی تھی۔
نیند سنان الیاس کی آنکھوں سے بھی بھاگ گئی تھی۔
کچھ غلط تو نہیں ہوا تھا مگر۔۔۔ مگر غلطی بہر حال ہوئی تھی۔
اسے اس وقت بھی احساس تھا اور اب رات کے اس تنہا خاموش پہر میں اور زیادہ۔۔۔
شرمندگی شجرہ سے بھی اور خود سے بھی۔۔۔
اسے اپنا ذہن اس وقت سے اب تک ایک ٹھٹھری سی کیفیت میں گم لگا تھا۔ باوجود اس کے کہ اس نے شعوری کوشش سے ذہن کو حاضر رکھتے ہوئے شجرہ کو تسلی دی تھی' بے فکری کی تلقین کی تھی۔ کچھ نہیں ہوا۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا کا درس بھی دیا تھا۔
مگر اس وقت خود کو آئینے میں گھورتے ہوئے وہ۔۔۔ ٹھنڈی سانس بھر رہا تھا۔

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

تالی ایک ہاتھ سے کب بجتی ہے۔۔۔

☆ ☆ ☆

وہ شیطان مردود تھا اور رات کے اس پہر جشن مناتے ہوئے شیطانی قہقہے لگا رہا تھا۔
اس کے اسی جیسے مردود و منحوس کریہہ صورت والے چیلے۔۔۔ کسی قدر حیرت میں مبتلا تھے مگر احترام شاگردی کے تحت دل میں اٹھتے ان گنت سوالوں کو فی الوقت پس پشت ڈالے ہوئے قہقہوں میں شریک تھے۔
ادھر ایک آنکھ کا شیطان ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کی ہنسی تھمنے میں آتی ہی نہ تھی۔ ذرا سا سانس لینے کو توقف کرتا اور پھر سے شروع ہو جاتا۔
ساری کائنات کے جانداروں سے قوت گویائی چھین لی جائے اور ہر سو کتوں' گدھوں' الوؤں' گیدڑوں اور کوؤں کو بولنے پر لگا دیا جائے تو کیسا سماں ہوگا۔ ایسا ہی ہوگا جو اس محفل میں تھا۔
"ہمارا تو یہ خیال تھا کہ تم ان دونوں کے بیچ طلاق کروانا چاہتے ہو مگر۔۔۔" ایک چیلے نے پوچھ لیا۔

"کیونکہ تمہیں نکاح سے نفرت اور طلاق سے محبت ہے۔" دوسرے نے وجہ بھی بیان کر دی۔
"اور پھر جو کچھ بھی آج ہوا۔۔۔ وہ تو کہیں سے بھی گناہ نہیں تو تم خوش کیوں ہو؟"
تیسرے کا سوال سب کا ترجمان تھا۔
"ہاہاہا۔۔۔" وہ مزید ہنسا۔
"ہاں اے شیطان۔۔۔ ہم سچ میں تیری خوشی کا سبب نہیں جان سکے۔ تیرے کہنے پر ان دونوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے۔ بہت مشکل کام تھا وہ تو بس ہمہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے میں مگن رہتے۔ ایک دوسرے کو ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے۔"
"مگر اب لگا چکے ہیں' ہاہاہا۔۔۔" وہ ایک بار پھر جھومنے لگا تو تمام چیلے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اپنی خوشی میں مست شیطان مردود جواب دیتا ہی نہ تھا۔
"تم سب میرے چیلے ہو اور جانتے ہو کہ میں کوئی کام بغیر سبب اور فائدے کے نہیں کرتا' میں طویل المیعاد منصوبے بناتا ہوں اور صبر سے نتیجے کا انتظار کرتا ہوں۔ ویسے تو صبر مومن کی خوبی ہے۔ ہمارا اس سے کیا کام۔ مگر یہ مزے کی چیز کہ اس کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے۔ سو تم سب بھی دیکھو کہ کیا ہونے والا ہے اور کیا ہوگا؟"
"تو کیا اب یہ مشن ختم ہوا یعنی ان دونوں پر ہمارا کام ختم ہو گیا۔"
"ارے نہیں' یہ کس نے کہا؟" مردود بری طرح چونکا۔ "ہمارا کام۔۔۔ اصل کام تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ ہاہاہا۔"
ابلیس مردود جھوم رہا تھا۔ نجانے تصور کی آنکھ کس چیز کی منظر کشی کر رہی تھی۔ اعوذباللہ من الشیطن الرجیم۔

☆ ☆ ☆

اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملنا ترک کر دیتے یا جہاں بھی اک دوجے کو پاتے تو راہ بدل لیتے۔۔۔ لاحول پڑھ لیتے۔
نظریں چرا کر۔۔۔ ہچکچا کر۔۔۔ وہ ایک بار پھر روبرو تھے۔
بھلے سے بیچ میں بہت دن کا وقفہ آگیا تھا۔ سنان ماسٹرز کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ آفس۔۔۔ جانے لگا تھا اور فقط ایک دو دن کے آرام کے بعد شجرہ اب نئے مشن کی تیاریوں میں لگ گئی تھی۔ اسے مقابلے کا امتحان دینا تھا اور آخری مرحلے تک کی کامیابی حاصل کرنا تھی۔ مکمل کامیابی۔۔۔
اور سنان الیاس ہر مرحلے میں اس کے شانہ بشانہ تھا۔ ہمیشہ سے۔۔۔ تو اب کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس کی فائلز پکڑ لیتا اور اپنی ہلکا سا جھٹکا کھاتی ٹانگ کے ساتھ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا۔
شرمندگی کے احساس کے ساتھ ساتھ شجرہ کو اب اس سے حیا بھی آنے لگی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر پاتی ہے۔ ساتھ چلتے چلتے وہ غیر ارادی طور پر ذرا سا دھیما ہو جاتی اور پھر اسے جی بھر کے دیکھ لیتی۔
کچھ ایسا ہی حال سنان کا تھا۔ وہ اس سے یوں مخاطب ہوتا جیسے کسی غیر سے۔۔۔ ضروری سے ضروری بات کرتے ہوئے ہر جگہ دیکھتا بس اس کے چہرے کو نہ دیکھتا اور جیسے ہی وہ اپنے کسی دھیان میں مگن ہوتی۔۔۔ وہ کسی شاطر چور کی طرح کامیاب واردات کر لیتا۔ جی بھر کے اسے دیکھتا' ایسے جیسے نقش نقش ازبر کر لینا چاہتا ہو' گھول کر پی لینا چاہتا ہو۔
اس کا دیکھنے کا نظریہ بدل گیا تھا یا وہ ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ نئی نئی' انوکھی' اچھوتی' پھر دونوں نے جیسے ایک دن دونوں ہی کی چوری کو پکڑ لیا۔
"ایسا کون سا غضب ہو گیا آخر۔۔۔ کہ تم منہ چھپائے پھرتی ہو؟"
"تم نہیں۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم دونوں ہی۔۔۔" اس نے ذرا سی نگاہ اٹھائی تھی۔
وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ "ہاں ہم دونوں ہی۔۔۔ مگر شجرہ۔۔۔ کوئی سوچا سمجھا ارادہ نہیں تھا بس ایک دم۔۔۔ مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟"
"اسی بات کا تو دکھ ہے کہ اب کچھ بھی پلٹایا نہیں

جاسکتا' سیدھے سپاٹ ورق کو اگر ایک بار موڑ دیا جائے صدیوں بعد بھی پھر جب اس کتاب کو کھولیں۔ نشان موجود رہتا ہی ہے۔" اس نے جیسے معذرت کے اگلے سارے جملوں۔۔۔ تسلی کے پیروں کا راستہ بند کردیا۔ واقعی گیا وقت لوٹ کر نہیں آسکتا کہ جو کچھ ہوگیا۔۔۔ ہوگیا۔

سنان واقعی لاجواب ہوگیا۔

اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑدیں اور اس بار شجرۃ نے نگاہیں نہیں چرائیں جیسے وہ بھی جواب کی منتظر تھی۔

جو خوف دل میں چھپا ہے' وہ کیسے دور کریں
اب اس کے واسطے کیا پھر کوئی قصور کریں؟

شجرۃ لڑکھڑا سی گئی۔ اس کی پلکیں یک دم جھک گئیں اور ہونٹ لرزاٹھے' پھر جب اسے نظروں کے مسلسل اپنے چہرے پر بھٹکنے کا احساس ہوا تو نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی کہ اس کا لہجہ بہت عجیب سا لگا تھا اور آواز بھی نئی نئی تھی۔ پہلے تو کبھی نہیں سنا تھا نہ محسوس کیا تھا۔

"جانا بوجھا منصوبہ نہیں تھا شجرۃ۔۔۔!" وہ اس کے نزدیک تر ہوگیا۔" ورنہ بہت پہلے ہی سب ہوجاتا بس۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ۔۔۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔

فتح کی بزم سرشاری تھی' بھیگی رات کا حال نہ پوچھ
جبہ' خرقہ' پگڑی' ٹوپی مستی میں انعام ہوئی

"تو اسی بات کے لیے تو روتی ہوں اور نظریں چراتی ہوں۔" اس نے پہلے کبھی اتنی جلدی شعر نہیں سمجھا تھا' وہ رخ پھیر کے گویا ہوئی۔ "ایسی بھی کیا مستی؟ کہ ہوش ہی کھودیں۔ ایسے کہ کچھ نہ بچے۔" وہ ایک بار پھر سب یاد آنے پر خود کو نظریں ملانے کے قابل نہ پاتی تھی۔

"کیا کھودیا یار۔۔۔ کیا نہ بچا؟ سب کچھ وہی تو ہے' تم اور میں۔"

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں ہے پہلے جیسا۔۔۔ مجھے لگتا ہے میں۔۔۔ میں خراب ہوچکی ہوں۔ میں۔۔۔" وہ رونے لگی۔ "مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے اور تم سے۔۔۔ تم سے بھی۔۔۔"

"کیسی بے وقوفی ہے' میں سمجھ رہا ہوں تمہاری کیفیت مگر اب کم از کم ایسے نام بھی نہ دو۔ بیوی ہو تم میری' ایسی بھی کیا بات۔ کوئی مذاق ہے بھلا؟"

"نہیں۔" وہ گھبرا کر ذرا سی پیچھے سرکی۔ "لوگ کیا کہیں گے اگر جو کسی کو پتا چل جائے تو۔۔۔ رخصتی سے پہلے۔۔۔"

"کم آن شجرۃ۔۔۔!" وہ اپنا سر پیٹ لینے سے بدقت رکا تھا۔ "نکاح کے بعد۔۔۔ یہ کیوں بھولتی ہو؟" وہ اسے پچکارنے لگا۔۔۔ دلاسا دینے لگا۔۔۔ بے فکری کا درس۔۔۔ ہمیشہ کی طرح وہ اسے قائل کررہا تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے' دھوکا دے کر بھاگ جاؤں گا۔ یار بیوی ہو تم میری۔۔۔" وہ پورے دل سے مسکرایا تھا اور اس کی آنکھیں بھی بولتی تھیں۔ وہ لفظ بیوی کہہ کر سارا قصہ سمیٹ دیتا تھا۔

شجرۃ کو دوسری بار یہ لفظ سن کر عجیب سی تسلی کا احساس ہوا اور یہ چیز آنکھوں سے بھی جھلکنے لگی۔

پچکارنے اور دلاسا دینے کا انداز غیر محسوس طریقے سے بدلا ہوا سا تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھے' وہ جو اک حجاب مائل تھا وہ پردہ تو سرک چکا تھا۔

اس کے چھونے میں استحقاق تھا۔ اس کے محسوسات میں بے دھیانی تھی اور پھر اسی بے دھیانی اور حق کی کوکھ سے ایسے پچھتاوے دینے والے مزید واقعات کا ظہور کچھ اس طرح ہوا کہ جو ایک پشیمانی کا احساس ہر پل ستا رہا تھا۔ معدوم ہوتے ہوئے ختم ہوگیا۔

ہر بار آئندہ کے لیے تائب ہوجاتے اور نظریں چرالیتے۔ پھر کچھ روز بعد سب نارمل' اچھے ذی ہوش شریف سلجھے ہوئے عاقل و بالغ انسان تھے۔ عملی زندگی کے سارے عوامل و شرائط کی خبر رکھتے تھے۔ سیدھا راستہ اپنا لیتے۔ کوئی رکاوٹ تو نہیں تھی۔ ایک بار اس پہلو پر سوچتے تو۔ شادی کیا دنیا کے کام کرنے سے منع کرتی ہے۔ شادی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے کا نام تو نہیں کہ شادی کے بعد کچھ کرنہ سکیں گے۔ کرنے والے سب کرتے ہیں۔

مگر نہیں۔ سنان کو ابھی بزنس میں سیٹ ہونا تھا وہ گھر کا چھوٹا بچہ بن کر سالوں عیش کرچکا تھا' مگر اب چھوٹا بچہ رہا نہیں تھا۔

ادھر شجرۃ دن رات دنیا بھلائے پڑھتی۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ صرف پڑھائی' امتحان باقی سب بعد کی باتیں ہیں (پہلے ہو بھی چکی تھیں۔۔۔)

لیکن اس قطعیت کے بیچ جب وہ دونوں ملتے تب۔۔۔ نجانے کیسے "حد" کئی بار حد سے آگے بڑھ گئی۔

اتنی کہ احساس بھی جاتا رہا۔

☼ ☼ ☼

امتحان ہر بار اس کی جان پر عذاب بن کر ٹوٹتے تھے' مگر اس بار کا امتحان تو جیسے ساری توانائی نچوڑ رہا تھا۔ اس کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں تھی اس نے بہت آگے کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ اسٹیپ بائے اسٹیپ۔

کمرے میں پڑھتی سیڑھی پر بیٹھ کر پڑھتی۔ چھت پر ٹہل کر۔۔۔ اخبار لگوا رکھے تھے۔ محسنہ خوش ہوتیں چلو تھوڑا سا تو ریلیکشین۔۔۔ بعد میں پتا چلا وہ بھی امتحان کی تیاری کا ایک حصہ ہے۔

محسنہ کو اب اس کی محنت کا خیال تھا۔ وہ اس کے کھانے پینے کا خود سے خیال رکھنے لگی تھیں۔ پوری ٹرے سجا کر تینوں ٹائم لے جاتیں۔ الگ سے دودھ بھی لگالیا' مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ دن بدن لاغر ہوتی جارہی تھی۔ اس کا چہرہ اترا اترا سا رہتا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ ترین حلقے رت جگے کی علامت تھے (وہ رات گئے تک کچھ نہ کچھ لکھتی پڑھتی تھی)

کتاب منہ پر ڈال کر دل میں پڑھتی۔ کبھی بچوں کی طرح کچھ اونچے جملے بولتے' پھر مدہم ہوجاتی پھر غافل۔۔۔ مگر غفلت تھوڑی دیر کی ہوتی۔ جھرجھری لے کر بیدار ہوتی پھر پڑھنے لگتی۔ محسنہ دودھ پینے پر زور دیتیں وہ کالا کڑوا قہوہ پی کر نیند بھگاتی۔

"نیند کو بھگاتی ہوں امی۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ کتاب کھولتے ہی جمائیاں آنے لگتی ہیں' میرا تو جبڑا دکھ گیا۔"

"تو ضرورت کیا ہے امتحان کو اتنا سر پر سوار کرنے کی۔ ابھی تو بہت دن پڑے ہیں' ہوجائے گی تیاری۔" ہما بھابھی تسلی دیتیں۔ سب "تائید!" سہلاتے۔

"جان ہوگی تو جہان ہوگا' میں تو کہتی ہوں اسے ڈاکٹر کو دکھادیں۔ رات بھر کتابیں پڑھتی ہے۔ نیند پوری ہوتی نہیں۔ دن میں جمائیاں۔۔۔ بھلے سے پڑھے لکھے نہیں ہیں' مگر یہ تو معلوم ہے نا' پڑھنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے۔" مامی نے بھی کہا۔

سب نے تائید کی۔ محسنہ کے خیال کو بھی راہ ملی۔

حیرت انگیز طور پر وہ بھی ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار ہوگئی کہ خود بھی اپنی کیفیت سے عاجز آئی پڑی تھی۔

خوامخواہ میں بیماری طول پکڑ لیتی اور امتحانوں کی راہ میں حائل ہوجاتی۔

☼ ☼ ☼

فضا میں تیرتی ہے
دیر تک یہ گرد کی صورت
محبت درد کی صورت
محبت خواب کی صورت
نگاہوں میں اترتی ہے کسی مہتاب کی صورت
ستارے آرزو کے۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ جو اسے اپنا آپ دھتکارا ہوا سا لگتا تھا' ذہن اور سوچ اتنی پختہ نہیں تھی کہ اپنی الجھنوں اور سوالوں کو ترتیب سے بٹھاتا اور ایک ایک شکل گھڑ کر فیصلہ صادر کرتا' نتیجے پر پہنچ جاتا کہ ہاں وہ جو کچھ سوچتا ہے یا جن چیزوں کا اسے یونہی گمان ہوتا ہے وہ دراصل درحقیقت یوں ہی یوں تھیں۔

اسے لگتا اس سے محبت تو کی جاتی ہے ' مگر ایسی محبت جو عیاں نہ ہو جائے ' کسی کو اس محبت کی خبر نہ ہو جائے۔ بس محبت ہے دل کے نہاں خانوں میں۔ اظہار کی کیا ضرورت۔

اپنے الجھے ہوئے خیالوں اور سوالوں کو سلجھانے کے لیے وہ تو بس "حال" پر نظر رکھتا تھا یا ماضی کہ تب اور جب اور کب۔ بس اس کے بعد ذہن کی سلیٹ خالی ہو جاتی تھی۔

دس برس کی عمر میں اسے لگتا تھا اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بوجھ سمجھا جاتا ہے اس کے پاس ثبوت اور گواہ نہیں تھے ' فقط گمان اور قیافے۔

اور سچ یہ تھا کہ وہ واقعی انجان تھا ' مگر اسے دھتکار آگیا تھا نا جب وہ پانچ برس کا تھا اور جب وہ پیدا ہوا تھا اور جب وہ پیدا ہو رہا تھا اور اس کی ماں کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے نوچ کر خود سے دور کر دے۔

دھتکارنے ' دامن جھٹکنے کا عمل تو اس وقت ہی شروع ہو گیا تھا جب اس کی ماں کو اس کے اپنے وجود میں سانس لینے کا پہلا احساس ہوا تھا۔

ماں ہی کیوں۔ گرد و پیش کے سب لوگ۔ جو اس کے متوقع رشتے تھے۔ وہ دنیا میں آجاتا تو سب سے اس کا کوئی نہ کوئی رشتہ ہوتا۔ خوب صورت رشتے ' مگر وہ سب حیرت سے اس کی ماں کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

"مجھے نہیں چاہیے سنان۔ یہ۔ یہ کیا ہو گیا۔" وہ مچل مچل کر رو رہی تھی۔ بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔ "سب پوچھ رہے ہیں ' اس کا باپ کون ہے؟" اس کی آواز بھی گھٹ کر نکلتی تھی۔

سنان کے سر پر ڈنڈا برسا۔

"تو۔؟ کون کا کیا مطلب۔ میں ہوں ' میرے علاوہ کون ہو گا۔"

"آف۔؟" شجرۃ الدر کے ارد گرد جلتے شکوک کے بھانبڑوں پر پانی پڑ گیا۔ مامیوں نے پوچھا تھا ' بچے کا باپ کون ہے ' وہ ٹکر ٹکر منہ دیکھتی تھی۔ مگر منہ سے نکل گیا۔

"سن۔ سنان۔" اور مامیوں کے منہ پر ہاتھ پڑا اور محسنہ کے دل پر۔

یہ کیسی کہانی تھی۔ وہ بیٹی سے کیا باز پرس کریں اسے بے عزت کریں۔ ذلیل و خوار کوسیں مگر۔ کیا کہہ کر کوسیں کہ اس نے عزت کا جنازہ نکال دیا اور موئی کو ذرا لاج نہ آئی منہ کالا کر کے آتے ' مگر جملے زبان کی نوک پر آ کر رک جاتے۔

منہ کالا تو نہیں کیا تھا اور لاج کس چیز کی ' وہ بیوی تھی اس کی ' مگر عزت کا جنازہ بہرحال تیار کھڑا تھا۔ کندھوں پر سواری۔ راستے۔ گلیاں چوک۔ چوراہے ' کتنے ہی کندھے بدل جاتے۔ دفن کرنے کے مرحلے تک۔

اور شجرۃ الدر کا دماغ سن تھا۔ سب ہی نے ہزار باتیں کیں ' مگر ماں کا ایک جملہ دماغ میں جا کر اٹک گیا تھا۔

"سنان کا ہے ' یہ تو اس نے کہہ دیا۔ وہ بھی مانے گا نا۔ یا پھر۔؟"

اور یہ تو فقط شجرۃ جانتی تھی کہ وہ سنان ہی کا بچہ تھا۔ سنان اور شجرۃ کا۔

محسنہ منہ پر کپڑا رکھ کے بے آواز روتی تھیں اور دکھ یہ بھی تھا کہ کوسنے ' رونے اور بین ڈالنے کے لیے کوئی جملہ موزوں نہ لگتا تھا۔

وہ کن الفاظ میں بیٹی کو بتاتیں کہ کیا کر بیٹھی ہے۔

ڈاکٹر پرانی جاننے والی تھیں۔ مامیاں تک ان کے پاس جایا کرتی تھیں۔

"نکاح کا تو مجھے پتا تھا ' رخصتی میں بلایا نہیں محسنہ۔ ماشاء اللہ اتنی قابل بچی ہے تمہاری۔ ماں باپ ذہین و محنتی ہوں تو بچہ تو خود بخود قابل پیدا ہو گا نا۔"

"رخصتی اور بچہ۔؟" محسنہ ٹکر ٹکر ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھیں۔

"اچھی طرح کھایا پیا کرو اور یہ تمہاری امی کیا کہہ رہی ہیں امتحان کی ٹینشن اب کون سا امتحان دے رہی ہو۔"

"سی ایس ایس۔" اس کے ہونٹوں سے پھسلا۔

"مجھے یقین ہے تم اس میں بھی کامیاب ہو گی ' مگر پھر بچہ بعد میں کرنا تھا نا۔" ڈاکٹر بی پی بیلٹ کو اس کے بازو سے کھول رہی تھی۔ "ہاں مگر یہ بھی طے ہے کہ جس روح نے جب دنیا میں آنا ہو۔" وہ محسنہ سے شجرۃ سے اور آپا سے مخاطب تھیں۔ آپا جو محلے دار تھی اور اسپتال کے بعد کیس بھی کرتی تھی اس وقت سب سے زیادہ منہ اس کا کھلا تھا۔ (رخصتی تو ہوئی ہی نہیں تھی ابھی اور رخصتی ضروری تھی)

چھپنے والی بات ہی نہیں تھی اور کاش چھپانا آسان ہوتا۔

سنان نے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ نہیں۔ دونوں ہی نے۔

"اتنی بے صبری تھی تو اس کے گھر جا کر ہی مرتی نا ' من مانیاں کرنے کا تو پہلے دن سے شوق ہے۔ اپنے منہ سے پھوٹ دیتی۔" آفاق نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ کیا کچھ بک رہے تھے۔ اس کا انہیں ادراک بھی نہیں تھا۔

"بلاؤ اس خبیث کو۔ گھسی پڑی رہتی تھی ' ساتھ آ رہے ہیں۔ ساتھ جا رہے ہیں ' گھما رہے ہیں رنگ تو چڑھنا تھا ہی۔ اس سے کہو لے کر جائے اپنے گناہ کی پوٹ کو۔ میرے گھر میں یہ بے شرمی کا اسٹیج نہیں سجے گا۔ کیا کہوں گا دنیا سے کنواری بہن کا بچہ ماموں بول رہا ہے۔ آخ تھو۔"

"کنواری تو نہیں تھی۔ نکاح کیا تھا۔ گناہ تو نہ کہو۔" محسنہ بلبلائیں۔

"تو منہ چھپا کر رو کیوں رہی ہیں۔ حلوائی بٹھالیں دروازے کے باہر۔ نانی بننے والی ہیں خیر سے۔" آفاق کے دانتوں کی کچکچاہٹ سب کو محسوس ہو رہی تھی۔

محسنہ کے رونے میں اور شدت آ گئی۔ یہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

"ہر فن مولا" نارے توڑتی بیٹی کے کہے پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا ہے۔ پکا پتا لے لیں۔ اس کا بچہ ہے نا۔ کل کو آ کر وہ بھی انکار کر جائے کہ میں تو جانتا ہی نہیں۔" شجرۃ کونے میں لگی بیٹھی تھی۔ تڑپ کر رہ گئی۔

"آفاق! زبان سنبھال کر۔" بڑے ماموں کی پیشانی عرق عرق ہو گئی۔

"شجرۃ غلطی کر سکتی ہے۔ گناہ نہیں۔" ان کے جملے میں شجرۃ کے لیے گواہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔

سنان نے آفاق بھائی کے زوردار دھکے سے بمشکل گرنے سے خود کو روکا تھا۔

"شجرۃ کا کوئی قصور نہیں۔ میری ہی غلطی تھی۔" شرمندگی نے اس کے چہرے کو تپا دیا تھا۔ دھواں دھواں آنکھیں۔ "میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔"

"اور کوئی سزا وزا نہیں۔ اٹھاؤ بوریا بستر اور نکلو ادھر سے۔ ابھی اور اسی وقت۔ دوبارہ شکل بھی نہ دکھانا۔"

"میں کل۔ کل امی کو لے کر آؤں گا۔"

"کیوں۔ باجوں گاجوں کے ساتھ بارات لانی ہے۔ اب بھی ارمان باقی ہیں۔ بہت خوب!"

"آفاق۔!" بڑے ماموں کا چہرہ خفت سے لرز گیا۔ ان کے بیٹے کے جملے۔

"کئی لوگوں نے کہا تھا اتنی قابل لڑکی کے لیے یہ لنگڑا ہی رہ گیا تھا۔ ایک سے ایک شان دار مرد مل جاتے ' کہیں تم نے بھی تو نہیں سن لیا تھا یہ اعتراض۔" تمام حاضرین چونکے تھے۔ سر اٹھے تھے پھر نظریں جھکی تھیں۔

"اوف۔!" بہت خراب حالوں میں بیٹھی شجرۃ نے پل بھر میں آفاق بھائی کا سارا اندر پڑھ لیا۔

غیرت و عزت کے احساس سے بڑھ کر حسد ابھر ابھر کر وار کرتا تھا اور وہ وار کو ان دونوں کی جانب پلٹاتے تھے ' مگر ایک پل سکون نہ ملتا تھا۔

"بہرحال امی کو لاؤ یا ابو کو۔ یہاں کوئی نہیں ہو گا ' پھولوں کے ہار لے کر استقبال کے لیے۔ پھپھی کا منہ نہ ہوتا تو جوتوں کا ہار ڈال کر مین روڈ تک لے کر جاتا۔

اب بات کچھ یوں ہے کہ یہ بیٹھی ہے سامنے۔ ہاتھ پکڑو اور نکل لو۔ پیاں پیاں (پیدل پیدل)۔" آفاق نے چٹکی بجا کر شجرہ کو متوجہ کیا اور دروازہ دکھایا۔

"آفاق!" چھوٹے ماموں نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔ اچھے جملے اور برے جملے ان کے پاس بھی تھے مگر کوئی بھی نوک زبان پر آ نا نہ تھا۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی جیسے۔

"اور تم اپنی ماں کو لاؤ اور ــــ" وہ بات ادھوری چھوڑ کر سنان کی صورت دیکھنے لگے۔ "کیا کہہ کر لاؤ گے ــــ وہ آجائیں گی نا۔ بہت بیمار ہیں نا وہ ــــ" (سنان کی امی مکمل طور پر بیڈ پر تھیں۔ ایک نرس رکھ کر دی گئی تھی)

"لے آؤں گا۔ وہیل چیئر پر موو کر لیتی ہیں اور سچ کہہ کر لاؤں گا۔" اس نے جھکا سر اٹھا کر بہت اعتماد سے کہا تھا اور لفظ "سچ" کہتے ہوئے سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

"کیا رخصتی لو گے؟" چھوٹی مامی نے پہلی بار لب کھولے۔

سنان اثبات میں سر ہلانے والا تھا۔ لیکن محسنہ کے جملے نے سر کو جھکا دیا۔

"شادی کے پانچ ماہ بعد بچہ تھوڑی پیدا ہوتا ہے۔"

"تو کیا اب یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ اس گھر سے نکالیں اس کو۔ بچہ کل پیدا کرے یا چار سال بعد۔ میں اس بدنامی کو پوٹ کو یہاں برداشت نہیں کروں گا۔"

آفاق کے جملوں سے زیادہ لہجہ خطرناک اور ارادے ہولناک تھے۔ ماتھے کی پھڑکتی رگ۔ بھینچی مٹھیاں۔ پھولتے پچکتے نتھنے۔ مجلس برخاست۔

آفاق گھر سے باہر نکل گئے تھے۔

محسنہ سر پر ہاتھ رکھ کے آواز دبا دبا کے رونے لگیں۔ موت کا سا سناٹا ہر سو چھا گیا تھا۔ ہما بھابھی حسرت آمیز نگاہوں سے شجرہ کو دیکھتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بے آواز گر رہے تھے۔ بڑی مامی نے نگاہوں کا مفہوم پڑھا تو۔ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔ واہ اللہ تیرے رنگ۔

سنان آنگن میں اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ شجرہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کوئی تسلی یا تشفی یا کچھ بھی۔ مگر۔

وہ گھر سے باہر نکلا تو شام اندھیرے کی بغل میں منہ چھپانے والی تھی۔ اس کا چہرہ تفکر کے جال میں چھپا پڑا تھا۔

سنان کو پتا نہیں چلا۔ اس کے نکلنے کے کتنے لوگ منتظر تھے۔ کتنی کھڑکیاں اور دروازے بینا ہو گئے تھے۔ اچک اچک کر اسے دیکھتے تھے۔ اشارے کرتے تھے۔ وہ تو چلا گیا۔ اب پیچھے اتنا چٹ پٹا مزے دار انوکھا قصہ زبان زدِ عام تھا۔

✲ ✲ ✲

"مجھے شادی نہیں کرنی سنان۔ میرے پیپرز سنان!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "بس مجھے اس سے چھٹکارا دلوا دو کسی بھی طرح۔ میں یہ سب افورڈ نہیں کر سکتی۔"

نفی میں سر ہلاتے ہلاتے وہ اچانک جنونی سی ہو گئی اور اپنا دامن یوں جھٹکنے لگی۔ جیسے کوئی کیڑا پتنگا جھاڑتا ہو۔

"ارے۔ ارے رکو شجرہ پاگل ہو گئی ہو۔ آرام سے۔ تحمل سے۔" وہ اسے باز رکھنے لگا مگر عجیب بات تھی۔ چھونے سے ڈر رہا تھا۔

"تمہارے خیال میں شادی تمہارے راستوں میں حائل ہو گی۔ میں تمہاری راہ میں حائل ہوں گا؟" اس کے سوال میں ارادہ بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بغور جھانک رہا تھا۔ شجو کی آنکھیں نہیں کہتے ہوئے جھک گئیں وہ رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔

"لیکن اس نے۔ اس نے تو میرا تماشا بنا دیا۔ سب مجھے دیکھ رہے ہیں۔ ساری دنیا میری بات کر رہی ہے۔ لوگوں کے پاس اب اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ سامیاں کہہ رہی ہیں۔ میری اس حرکت نے انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ایک عالم مجھ پر تھو تھو کر رہا ہے۔

آفاق بھائی اسے گناہ کہہ رہے ہیں۔ یہ گناہ ہے

سنان؟"

"کوئی نہیں۔ بالکل نہیں۔" سنان ضبط کی انتہاؤں پر تھا۔ "تم منفی باتیں مت سوچو شجو۔ بالکل غلط کہتے ہیں وہ۔ یہ کہاں سے گناہ ہو گیا۔ بس۔" اسے اگلا جملہ نہ سوجھا۔ "یہ تو محبت ہے وہ جو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ہے۔ بہت ساری۔"

"یہ محبت ہے؟" وہ چلانے سے بمشکل باز رہی۔ "اتنی ذلت میری ــــ محبت۔ محبت ایسی ہوتی ہے۔" وہ کرلائی۔ سنان کے لب بھنچ گئے۔ "میں دنیا کی باتیں نہیں سن سکتی سنان۔"

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ سنان کچھ نہ کہہ سکا۔ دنیا اور دنیا کی باتیں۔

آدمی کتنا ہی اچھا ہو فرشتہ تو نہیں
پہلا پتھر مارنے کو دل بھی پتھر چاہیے

✲ ✲ ✲

سنان کی امی ماؤں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھیں جو بہوؤں اور بیٹیوں دونوں سے بس ایک ہی مطالبہ کرتی تھیں کہ بچے جو جی چاہے کرتے رہیں۔ تہس نہس کر دیں۔ بگاڑ دیں یا اجاڑ دیں انہیں ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہ دیکھا جائے۔ کچھ کہنا سننا تو خیال سے بھی دور کسی کے بھی حمل کی خبر سن کر ایسا شاہی پروٹوکول دیتیں کہ ماں سوچتی زندگی بھر ڈلیوری نہ ہو۔

ماں کے پاس مسئلہ لے جانے سے پہلے سنان نے بہت سے جملے ترتیب دیے۔ شجو کے گھر والوں نے رخصتی کی ڈیمانڈ کر دی تھی۔ ماں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ بستر پر پڑی تھیں اور چاہتی تھیں کہ رخصتی کروائی جائے سنان ہی نے شجرۃ الدر کے امتحان کا کہہ کر روک رکھا تھا۔ وہ ماں کو لاعلم رکھ کر شادی کا اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی اس آخری شادی کو بہت دھوم دھام سے کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں سب خاندان کی موجودگی میں۔

اتنا تو اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ ماں کے آگے حرف بہ حرف سچ کہنا ہو گا۔ یہ فیصلہ کر کے دل مطمئن ہو گیا تھا۔ مگر اسے یقین تھا ماں کے مزاج کے پیش نظر بچے ہی کا ذکر انہیں قائل کرے گا۔ کہ انہیں اپنی نسل بہت پیاری تھی۔ مگر۔

وہ پھیلے پھٹی آنکھوں اور کھلے ہونٹوں سے اسے تکتی رہیں۔ کیا وہ وہی کچھ سمجھ رہی تھیں جو وہ کہہ رہا تھا۔ پھر جیسے ان کے اندر حیوانی طاقت آ گئی تھی۔ وہ اپنے گال پیٹ رہی تھیں اور سر پر زور زور سے ہاتھ مارتی تھیں۔ توبہ توبہ کرتی تھیں اور سر دائیں بائیں پٹختی تھیں۔

"نیچ خاندان۔ بد کردار ایسی اندھیر مچا دی ــــ بے شرم، بے حیا میں تو اسے بہت شریف سمجھتی تھی۔"

"اماں ــــ!" اس نے بے ساختہ سر اٹھا کر احتجاج کیا۔ "وہ اکیلی قصوروار نہیں ہے اماں۔ میں بھی تو۔"

"ارے ہٹاؤ۔" اماں نے حقارت سے ہاتھ چلایا۔ "کس نے کہہ دیا عورت اتنی آسانی سے ہاتھ آجانے والی چیز ہے۔ اور رہے تم۔" ان کے لہجے میں بیٹے کے لیے بھی حقارت، نفرت اور مایوسی آ گئی۔

"مرد تو زندگی بھر جال ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ اس کی عقل کیا گھاس چرنے گئی تھی۔"

"ہو گیا ناں امی۔ جو کچھ ہونا تھا۔ آپ ایسے الفاظ استعمال کریں گی۔ تو میں باقی دنیا سے کیا امید رکھوں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ میری غلطی کو ڈھانپ لیں گی۔"

وہ یکدم کسی چھوٹے بچے کی طرح شکوہ کناں ہو گیا۔ زندگی میں کبھی اسے کسی نے سخت نہ کہا تھا۔ اور آج اپنی سگی ماں نے ماتو برہنہ کر دیا اور کوڑے مارے۔

"غلطی ڈھانپ لوں گی۔" اپنی سانسیں بحال کرتی امی کو جیسے کرنٹ لگا چونک کر بولیں۔

"تم پڑوسیوں کا شیشہ توڑ کر آئے ہو۔؟ کہ نیا لگوا دوں انہیں یا مکر جاؤں کہ میرا بیٹا تو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔"

سنان الیاس لاجواب ہو گیا۔

"کیا جواب دوں گی میں دنیا کو۔ کون سی آفت آ گئی مجھ پر۔" وہ خود کلامی کر رہی تھیں اور تیز مگر کپکپاتے

ہاتھوں سے کبھی سائیڈ بورڈ پر اور کبھی تکیے اٹھا کر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ گولی یا انہیلر۔

گولی ہاتھ پر رکھ کے وہ پانی لینا چاہتی تھیں۔ سنان سرعت سے گلاس کی طرف بڑھا۔ تو انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ خود پانی پی سکتی ہیں۔

سنان شکست خوردہ سا بیٹھ گیا۔ وہ خود میں سمٹا سمٹا جا رہا تھا۔

"ہم کہہ دیں گے کہ آپ کی ناسازی طبع کے باعث رخصتی جلد کرلی۔" بہت دیر بعد سنان کی جھجکی آواز ابھری۔

امی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے خود کو بحال کرنے کی تگ و دو میں تھیں۔ بری طرح چونکیں پھر چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

"بہت خوب اور یہ بہترین حل آپ کے اپنے دماغ کی تجویز تو لگتا نہیں۔ کسی اور ہی نے دماغ لڑایا ہے۔"

"وہ محسنہ آنٹی اور۔ اور ماسیاں۔"

"ہاں ہاں۔ وہی دے سکتی ہیں ایسے پلان۔ مگر یہ تو بتاؤ لخت جگر۔ دنیا کو یہ کیسے بتلاؤں گی۔ موت نے اتنی حسرت پیدا کردی کہ پوتا بھی پانچ ماہ بعد بلوالیا اللہ کے ہاں سے کہ اپنے جیتے جی بیٹے کا گھر بستا دیکھنے کا ارمان تھا اور پوتے کا منہ بھی دیکھنے کی طلب تھی۔ سو اتنی جلدی مچائی کہ شادی کے پانچویں مہینے دادی بھی بن گئی بھئی واہ۔ میں تو ولی ہوگئی۔ مرتے وقت کوئی حسرت حسرت نہ رہی۔ سارے ارمان ہی پورے کردیے۔ مثالیں دیں گے لوگ میری۔ واہ۔ خوف خدا نہ ہوتا اور تم برابر کے شریک کار نہ ہوتے اور ہوتی میں کوئی ذلیل عورت تو کاغذ منہ پر مار کر ہاتھ جھاڑ کے آتی۔ کیسی شادی' کہاں کی رخصتی۔"

"اماں کون کہے گا دنیا کو کوئی تکلیف ہے؟ میں جانتا ہوں میرا بچہ ہے وہ۔"

"ارے دنیا ہی کے تو سارے مسئلے ہیں۔ دنیا ہی کی فکر میں تو گھل رہے ہو جو رخصتی کی کہانی ڈالنے آگئے۔ دنیا کو کچھ نہیں سمجھتے۔ دنیا ہی تو سب کچھ ہوتی ہے۔ ہائے!" وہ گردن تکیے پر ڈال کر جیسے تازہ دم ہو کر ہائے ہائے کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

شجرہ نے رو رو کر کہا تھا۔ اسے اس مصیبت سے چھٹکارا چاہیے۔ کسی بھی قیمت پر۔ تب اس نے مصیبت کو محبت بتا کر اسے شانت کیا تھا۔

محبت کی نشانی۔ محبت کی مجسم صورت۔ تحفہ۔ عطیہ۔ محبت عزت کے ساتھ ملی تھی۔ پھر صورت بدل کر ذلت کیسے بن گئی۔

یہ اک شکست جو ہم کو ہوئی محبت میں
زمانے بھر کی فتوحات سے زیادہ ہے

ہر مقام پر فاتح' کامیابی کا جھنڈا گاڑ کے سینہ تان کر چلنے والی شجرہ الدر نے ہر شے کو اپنی مرضی کے مطابق کرلینا ہوش سنبھالنے سے پہلے سیکھ لیا تھا۔ نفی۔ یا ہار کا صفحہ اس کی زندگی کی کتاب کا حصہ تھا ہی نہیں۔

لیکن اب کی بار۔ وہ سب ہوگیا۔ جو قطعاً "نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یا پھر اس کا نتیجہ اس طرح سامنے نہ آتا۔ سیدھی... ہموار... رواں زندگی کے اندر اتنی بڑی غلطی۔

سیدھی زندگی کی رنگینی سے پیدا ہونے والی سنگینی۔

جس کے ارتکاب کے بعد "احساس" تک پیدا نہ ہوا۔

لمس میں ہوس نہیں تھی۔ محبت تھی۔ محبت طلب میں بدل گئی۔ غلطی پر شرمندگی تھی۔ رونا دھونا۔ پچھتاوا۔ دوبارہ نہ کرنے کا عہد۔ اور ایک دوسرے کو تسلیاں۔ محض تسلیاں۔

تو کیا ہوا۔

کوئی بات نہیں۔

ہمارا نکاح ہوچکا ہے۔ کون سا گناہ ہوگیا۔؟

لیکن وہ باتیں جو شجرۃ الدر سن رہی تھی۔ وہ کانوں میں پگھلا سیسہ تھیں۔

اور جو سنان الیاس۔ مسز الیاس کے منہ سے سن کر آیا تھا۔ دھیما بولتی حلیم الطبع مہذب نپا تلا بولنے والی

ماں کے جملے اور انداز۔

انہوں نے اس سے نجات کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

محبت ناریل پانی کی طرح ہوتی ہے۔ سخت خول میں ڈھکا چھپا۔ چلو بھر محفوظ پانی۔ سخت خول دراصل "عزت" ہوتا ہے۔

محبت عزت کے سخت خول سے جدا ہوجائے تو ایسے ہی خوار ہوتی ہے۔

جیسے چھلکا ہٹانے میں بے احتیاطی کریں تو ناریل پانی پیروں میں جا گرتا ہے۔

اور ان دونوں کی محبت پیروں میں گری پڑی تھی۔ پیروں سے زمین کھینچ چکی تھی۔

ڈاکٹر نے صاف قطعی الفاظ میں انکار کرتے ہوئے ایک لمبا پرچہ دوائیوں کا لکھ دیا۔ زبانی ہدایت نامہ اس کے علاوہ تھا۔

"ہم دوسرے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔"

یہ ڈاکٹر بوڑھی اور مذہبی... ہاتھ میں تسبیح تھی۔ وہ آدھی بات سن کر ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"تم لوگ پاگل تو نہیں ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو' وہ صاحب اولاد کررہا ہے۔ عبرت پکڑو ان لوگوں سے جو ترستے ہیں۔ قبروں پر بیٹھ کر چلے کاٹتے ہیں۔ اپنی گود سنوارنے کے لیے دوسروں کی کوکھ تک اجاڑ دیتے ہیں اور تم بچہ ضائع کروانے آگئیں' وہ بھی میرے پاس۔ میں نے کیا اس لیے پڑھا تھا کہ ڈاکٹر بن کر بچے ضائع کرواؤں گی؟"

یہ ڈاکٹر کی تقریر کا ابتدائیہ تھا۔ تقریر کے ساڑھے تین سو صفحات ابھی باقی تھے اور جنہیں وہ سنا لینا چاہتی تھی۔ سنان نے سانس کے وقفے کا فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر بولنے کا موقع دیتی ہی نہ تھی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں ڈاکٹر! آئی ایم سوری کہ ہم نے آپ کو ہرٹ کیا۔ دراصل میری مسز کے پیپرز ہورہے ہیں۔ ہمیں پتا ہی نہ چلا بے بی کا۔ یہ شدید اسٹریس میں آگئی ہے۔ سو۔" اس نے قصداً "جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شجرہ الدر یوں چپ تھی جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔

ہر جگہ سنان ہی بولا تھا۔

"اوہ ویری گڈ۔!" اس نے شجرہ کے ستے چہرے کو دیکھا۔

"کس چیز کا ایگزام ہے۔"

"سی ایس ایس۔" سنان ہی بولا۔

"اوہ گریٹ۔ کب ہیں پیپرز۔؟" ڈاکٹر کی آنکھوں سے ستائش جھلکنے لگی۔

"نو دن بعد۔" شجرہ کے لب سے جیسے سسکی نکلی۔

"تو پھر پریشانی کی کیا بات۔ آخر یہ نئے زمانے کی لڑکیاں پریگننسی کو بیماری کیوں سمجھ لیتی ہیں۔ اٹس نیچرل پراسس' اگر عورتیں اس حالت میں بستروں میں پڑجائیں تو کیا ہوگا۔ اللہ نے دنیا کام کرنے کے لیے بنائی ہے یا کہ آرام کرنے کے لیے۔" ڈاکٹر ڈپٹ کر کہہ رہی تھی۔

"میں خود اپنے لاسٹ منتھ میں ایک ایک دن میں چھ چھ سیزرین کرتی تھی اور میرے اپنے چھ ہی بچے ہیں۔ اور میں اسی طرح جاب پر آتی تھی اور اپنا کیس بھی کروالیتی تھی۔ مگر آہ۔ یہ آج کل کی لڑکیاں۔"

ڈاکٹر نے پرچا لکھنا شروع کیا۔ اتنا بڑا نسخہ کہ پرچے کی دوسری جانب بھی لکھنا پڑا۔

"دوائیاں برابر استعمال کرو۔ دودھ اور پھل زیادہ۔ اور اب مزید کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے یہ بچہ ضائع نہیں ہوسکتا۔ ماں کی جان کو سخت خطرہ۔ تمہیں ایگزام پاس کرنا ہے کہ نہیں لڑکی۔!"

"اب ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"کہیں نہیں۔ میں یہ دوائیاں خرید لوں ذرا۔" سنان نے نظریں چرا کر کہا تھا۔

وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

شجرہ الدر نے مقابلے کے امتحان کو سب سے بڑا اور مشکل امتحان کہا تھا۔ اور وہ سردھڑ کی بازی لگا کر اس میں انت تک کی کامیابیاں چاہتی تھی۔ مگر اسے یہ

نہیں پتا تھا کہ وہ اس سے بھی بڑے امتحان میں پڑ جائے گی۔

مقابلے کے امتحان میں آنے والے ممکنہ اور غیر ممکنہ تمام سوال اس نے جیسے پانی کی طرح گھول کر پی لیے تھے۔

مگر۔ یہ کیسے سوال تھے۔ جو دنیا اس سے پوچھ رہی تھی اور پوچھ لینا چاہتی تھی۔ یہ کیسا امتحان تھا جس کی تیاری کا اسے خیال تک نہ رہا۔ وہ اپنی ساری ذہانت اور خود اعتمادی بروئے کار لا کر بھی ایک حدف جواب نہ کہہ پاتی۔

اسے دو ٹوک جواب دینا آتے تھے۔ اس کی شخصیت میں بہت نو عمری میں ہی ایک ایسا رعب پنپ گیا تھا جو مقابل کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیتا تھا مگر وہ کچھ نہ کہہ پاتی۔

دونوں ماموں اور بڑی مامی اور محسنہ۔ مسز الیاس کے پاس گئے تھے۔ مگر مسز الیاس جو اس روز کفن پھاڑ کر بولی تھیں "ان سب کے سامنے ایک لفظ نہ بولیں۔

اس دن کے جوش نے جیسے ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔ اور سچ بات یہ تھی کہ شدید صدمے اور شرمندگی نے بھی انہیں نچوڑ دیا تھا۔ بیمار تو وہ پہلے ہی تھیں۔ اس روز تو سارا الزام شجرۃ الدر پر رکھ کر ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔

مگر اتنا تو جانتی تھیں۔ بیٹا۔ زلیخا کے قصے کا "یوسف" نہیں ہے۔

یہ سب ان کے بیڈ کے گرد کرسیوں پر خاموش ہی بیٹھے رہے۔

مسز الیاس کے چہرے پر خیر مقدمی تاثر آیا۔ پھر شرمندگی پھر تکلیف بے بسی کے احساس سے آنسو۔ وہ بہت مجبور محسوس ہو رہی تھیں۔ طبیعت بہت خراب تھی۔ عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ اور ہر بار طبیعت خراب ہونے پر سب کو یقین ہونے لگتا۔ بس۔ لیکن وہ ابھر آتی تھیں۔

"مسئلہ رخصت کروانے کا نہیں ہے۔ ابھی کروا لاؤ۔ مگر پانچ ماہ بعد دنیا کو جواب وہی کیسے دو گے۔ تمہیں سب آسان لگتا ہے۔ اتنا بڑا خاندان ہے۔ آٹھ تمہارے اپنے بہن بھائی" آگے ان کے شوہر۔ بیویاں اور بچے پھر ان کے خاندان۔ اور ثنا اور غزل۔ اقرا۔ سہیل۔ عذیر۔ تمہارے ہم عمر ہیں۔ وہ کیا اثر لیں گے تم نے سوچا۔" انہوں نے بھتیجے بھانجوں کا ذکر کیا۔

"امی! غلطی انسانوں ہی سے ہوتی ہے۔" سنان انہیں کسی بھی طرح قائل کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں۔ اور غلطی انسانوں ہی کو بھگتنا پڑتی ہے۔"

سنان کے ہونٹ باہم پیوست ہو گئے۔ وہ کیا کرے۔

"والدین اولاد کی بڑی سے بڑی غلطی کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ لڑنے مرنے پر آجاتے ہیں۔ کجا کہ اولاد ہی کو "غلطی" کہہ دیا جائے۔ یہ تم نے کیا کر دیا سنان!"

وہ تول بول کر تھک گئی تھیں۔ ان کے پاس اور بھی بہت کچھ تھا کہنے کو مگر۔ اس دنیا کے لیے ان کے الفاظ بس یہیں تک کے لیے۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

☆ ☆ ☆

ہم سب زندگی میں بہت سی چیزوں سے خوف کھاتے ہیں کہ ایسا نہ ہو جائے اور ویسا نہ ہو جائے۔ اللہ نہ کرے۔ لیکن جب وہ چیزیں وہ باتیں ہو جاتی ہیں۔

یا۔

ہو رہی ہوتی ہیں تب۔

تب! وہ فیصلے کی گھڑی ہوتی ہے کہ ہم نے اب کیا کرنا ہے؟

شجرۃ الدر کے لیے یہ فیصلے کا وقت تھا اور اس نے اپنے حوالے سے ہمیشہ بہت فیصلے کیے تھے خود اپنی سوچ پر اپنے ارادے پر یقین کر کے۔

وہ ڈوب رہی تھی اور کوئی مددگار نہیں تھا۔ چاہ کر بھی کوئی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا سوائے خود ہی ابھرنا ہو گا۔

اس کے پیپرز میں تین دن رہتے تھے۔ تیاری مکمل تھی۔ ہاں وہ گزشتہ کئی دنوں سے شدید دباؤ کا شکار تھی۔

مگر ٹھیک ہے۔ وہ دنیا سے نہیں جیت سکتی مگر خود سے ہار جائے۔ یہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔

سنان نے ہار مان کر دوائیوں کا ڈھیر' دودھ اور جوس کے ڈبے اور بہت سارے نوٹ اس کے حوالے کر دیے تھے۔

ماموں۔ مامیاں اور محسنہ ایک دوسرے سے نظریں چرائے خاموش ہو بیٹھے تھے۔

زندگی ان کے لیے وہ وقت لائی تھی۔ جہاں انہیں صرف سامع کا کردار نبھانا تھا۔ (جو بھی کہا جائے)

جان چھڑوانے کی کوششیں۔ منصوبے۔ رخصتی۔ اور مسز الیاس کی موت۔ سوئم۔ سب ختم ہو گیا تھا۔

زندگی بعض اوقات ایسے بھی سمٹ جاتی ہے۔

اب کیا ہو گا۔؟ آگے کیا کرنا ہے؟

سب حیران رہ گئے پلکیں بھی نہ جھپک سکے وقت جو دکھائے دیکھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ ہم کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس نے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر پونی میں کسے۔ چہرے پر ہاتھ پھیرے لمبے سانس بھرے۔ وہ جگہ جگہ پڑی اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی۔ اپنے نوٹس ڈھونڈ رہی تھی۔ اپنا بیگ تیار کر رہی تھی۔ امتحانی گتہ' ایڈمٹ کارڈ' پاؤچ۔

پھر اس نے چارپائی پر تکیہ سیٹ کیا۔ گھٹنے موڑ کر موٹی کتاب ٹکائی اور وہ پڑھ رہی تھی۔ دھیما اونچا۔ تیز تیز۔ آنکھیں موند کر۔ پھر چونک کر کوئی نوٹس لیتی۔

اسے خود پر اختیار تھا۔ ہمیشہ سے حالات کو اپنی مرضی کا کر لینا فطرت بن چکی تھی۔

شجرۃ الدر نے طے کر لیا تھا۔ وہ وہی دیکھے گی۔ جس کے دیکھنے کا اس نے خواب دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

پیپرز کے دوران ہی شجرۃ اور محسنہ اوپری کمرے میں شفٹ ہو گئیں۔ آفاق پیپر دینے والے ڈرامے سے لاعلم تھا۔ صبح جب شجرۃ نکلتی وہ سویا ہوتا۔ مگر اسے پتا لگ ہی گیا۔ اس نے وہ طوفان اٹھایا کہ بس۔ ماموں گھر پر نہیں تھے وہ نچلے کمرے سے شجرۃ اور محسنہ کا سامان اٹھا اٹھا کر باہر صحن میں پھینک رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بول رہا تھا۔ اور کون تھا جو اسے روکتا۔ بولنے سے اور پھینکنے سے۔

"یعنی ابھی بھی ارمان پورے نہیں ہوئے۔ امتحان دینے ہیں۔ افسرنی بننا ہے۔ میں نہیں رکھ سکتا غلاظت کی اس پوٹ کو اپنے گھر میں۔ میں کیا بے غیرت ہوں۔؟"

محسنہ تھر تھر کانپتی تھیں اور روتی تھیں۔ ان کا رنگ لٹھے کی طرح سفید تھا۔ اور شجرۃ کمرے کے اندر نیم تاریکی میں کرسی کی ہتھیوں پر ہاتھ جمائے بے حس و حرکت آفاق کے جنون کو بس دیکھتی جاتی تھی۔ وہ عملی لڑکی تھی اور اس پل فقط یہ سوچ رہی تھی کہ کہاں جایا جائے۔

"ہم کہاں جائیں گے شجرۃ؟"

"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے امی۔"

"اتنے سال بھائی نے رکھا اور اب۔"

"جب تک انہوں نے رکھا۔ ہم رہ لیے اور جب وہ نہیں رکھنا چاہتے تو ہم کیسے رہ سکتے ہیں۔"

"شجرۃ۔" محسنہ سے کچھ اور کہا ہی نہ گیا۔

دونوں ماموؤں کی بروقت مداخلت نے آفاق کو باز رکھا۔

"میں نے کسی جرگے میں جا کر چار لوگوں کے بیچ قسم نہیں کھائی تھی کہ بہن کی بیوگی کو سہارا دوں گا۔ اور بھانجی کی ذمہ داری نبھاؤں گا۔ بس خود اپنے آپ سے عہد کیا تھا اور رہی۔ اس کی بیٹی۔ اسے امتحان دینا ہے تو دلاؤں گا۔ اور پھر اپنے گھر سے رخصت کر دوں گا۔ جیسے کہ بیٹیوں کو کرتے ہیں۔"

"حالانکہ رخصتی کی ضرورت تو نہیں ہے۔" ماموں کے بے حد ٹھہرے قطعی لہجے کے جواب میں آفاق بھائی نے جیسے سر پر کوڑا مارا ہو۔ ان کے لہجے کی کاٹ اور آنکھوں کی استہزا نے شجرۃ کو پسینہ پسینہ کر دیا۔

"اوپر شفٹ کرنے کے بجائے آپ اسے اصل جگہ ہی کیوں نہیں بھیج دیتے۔ بلائیں اس (گلی) کو

کس چیز کا انتظار ہے؟ اپنے گھر جا کر کرے جو کرنا ہے امتحان دے یا نہ دے ہمیں کیوں امتحان میں ڈالا ہوا ہے۔ افسر بنے یا چپراسی۔ ہماری جان چھوڑے!"

"آفاق ٹھیک کہہ رہا ہے۔" بڑی مامی نے لب کھولے۔ تب چھوٹی مامی نے بھی تائیداً" سر ہلا دیا۔

"نہیں بھیج سکتے۔" ماموں کی آواز بالکل مدھم ہو گئی جیسے خود کلامی ہو۔

"وہاں اب تک کوئی۔ اس صورت حال کے بارے میں نہیں جانتا۔ کیا جواب دے گی یہ۔ کس کس کی باتیں سنے گی؟"

"کیا۔؟" ماموں کے مدھم ترین لہجے کا الٹ آفاق بھائی کا بلند ترین "کیا تھا۔" تو کیا جوابدہی کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں دنیا کی باتیں سننے کو۔ اور "اس" کا کیا ہو گا۔" آفاق نے "اس" کا نام نہیں لیا مگر سب جان گئے، وہ آنے والے بچے کا کہہ رہے تھے۔

"اسے محسنہ پال لے گی یا پھر بعد کی بعد میں دیکھیں گے وہاں (سسرال) شجرۃ کی بہت عزت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ۔"

آگے ماموں خاموش ہو گئے اور آفاق بھائی بولتا۔ اور وہ زہر اگل رہے تھے۔ فحش جملے۔ گھٹیا مثالیں۔ شرمناک قصہ۔ مگر حرف بہ حرف صداقت۔ جو وہ دنیا سے سن رہے تھے اور جو سمجھ رہے تھے۔ ماموں نے جیسے مزید کچھ نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔ مامیاں دل ہی دل میں سب سوچتی تھیں آج آفاق کی ہمت کے بعد انہیں کم از کم ہاں میں ہاں ملانے کا حق تو ملا وہ سب اپنی اپنی مشکل میں تھیں۔ شادی شدہ بیٹیوں کی سسرالیں تھیں۔ ان کی زبانیں طعنے کنواری بیٹی کی شادی کے سلسلے میں مسائل ہو سکتے تھے۔

✲ ✲ ✲

دنیا میں آنے کے بعد زین سنان تمام احساسات سے ماورا تھا۔ سرد و گرم سے بچانے کے لیے نانی محسنہ نے اسے خوب اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ سر رومال سے باندھ کر ٹوپی پہنادی۔ بڑے ماموں نے اذان دی تو شہد بھی چٹا دیا۔ اگلا احساس بھوک کا تھا۔ تب نانی نے چھوٹی چمچی سے قطرہ قطرہ دودھ حلق میں ٹپکا دیا۔ اور سیری پالینے کے بعد وہ بے خبر ہونے لگا۔

دوسری جانب کروٹ کے بل اس کی ماں شجرۃ الدر بھی گہری پرسکون نیند کے زیر اثر تھی۔ اتنی طویل مشقت۔ وہ بہت اچھی نیند لینا چاہتی تھی۔ اس نے اس پل کا بہت انتظار کیا تھا (کب جان چھوٹے گی۔) اسے مزید بہت سی چیزوں کا انتظار تھا جس کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

زین سنان کو قطعاً" خبر نہیں تھی کہ جس آغوش میں اسے سکون آتا ہے وہ ماں کی نہیں نانی کی ہے اور چمچ اور فیڈر کے علاوہ بھی دودھ پینے کا ایک اصل اور فطری طریقہ بھی ہے کیونکہ ماں اس سے بے نیاز اس کی پیدائش کے تیسرے ہی دن الماری کھولے کھڑی تھی اس نے بہترین لباس کا انتخاب کیا۔ شان دار جوتا، اسٹائلش بیگ، ماں بڑے طریقے سے اسے چھٹی نہلانا چاہتی تھیں اور وہ ہر شے سے بے نیاز چوتھے ہی دن خود پر نیم گرم پانی کی دھار بہاتے ہوئے جیسے صدیوں کی میل اتار رہی تھی۔ تھکن اتار رہی تھی تازہ دم ہو رہی تھی۔

اسے تازگی کی ضرورت تھی۔ جسمانی بوجھ اس نے اتار پھینکا تھا اور ذہن پر کوئی "نیا بوجھ طاری" ہونے نہیں دیا تھا۔

اس نے تو اس روز سے اپنا ذہن ہلکا پھلکا کر لیا تھا جب اس نے اپنی کتابیں جھاڑ جھاڑ کر نکالی تھیں اور نئے سرے سے رٹے لگانے شروع کر دیے تھے۔ سب کے کھلے منہ اور آنکھوں سے چھلکتے سوالوں کو نظر انداز کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اس نے پہلے بھی کب پرواہ کی تھی دنیا کی۔۔۔

جب ایک پتھر کو ٹھوکریں مارتی کالج سے گھر تک لے آتی تھی۔ کبھی کبھار پتھر زیادہ زور لگنے سے راہ بدل لیتا یا بیچ راستے پڑا رہ جاتا تب وہ گرد و پیش کی قطعاً" فکر نہ کرتے ہوئے پتھر کے پیچھے جاتی تھی اور اسے راہ راست پر لاتی تھی۔

دیکھنے والے اس کھیل کو دیکھ کر جو بھی رائے دیں۔ پاگل، خبطی، بے وقوف، کچھ بھی۔۔۔ اسے اچھا لگتا تھا نا۔۔۔ سو وہ ایسا ہی کرے گی۔

وہ دوپٹے کو پیٹ پر پھیلا کر کتابیں سینے سے لگا کر بیگ شانے پر اور آنکھوں پر بہت چوڑے فریم کے گاگلز چڑھا کر گھر سے نکل گئی۔

لوگ اسے یوں دیکھتے تھے جیسے آٹھواں عجوبہ ہو، وہ اس قدر بااعتماد تھی کہ سب سنا سنایا جھوٹ لگا۔ یا وہ "دامن" جھاڑ کر گھر سے نکلی تھی؟ کچھ پتا نہ لگا صرف یہ کہ چار ماہ بعد آنے والے رزلٹ میں شروع کے آٹھ نمبروں میں سے تھی۔

دراصل شجرۃ الدر نے اپنی زندگی کے ایک اصول کو یاد رکھا تھا۔

جب ہار جانے کا خوف قوی ہو جائے تو لازما" ہار جاتے ہیں۔ اسی طرح جیت کا عزم کر لیں تو شکست سر نیہوڑائے دور کھڑی رہتی ہے۔ اس نے یقین رکھا تھا وہ جیت جائے گی سو جیت گئی اور آگے۔۔۔ آگے کہ ہر مرحلے کے لیے بھی اس نے خود کو فتح یاب ہی دیکھا تھا وہ خود کو کامیابی کی چوٹی پر چڑھتا نہیں دیکھ رہی تھی کہ کوئی بھی پیر کھینچ لیتا۔ وہ کامیابی کی چوٹی چڑھ چکی تھی بس جھنڈا لگا۔ باقی تھا۔

زین سنان کی ڈلیوری ڈیٹ۔۔۔ اور سی ایس ایس کے انٹرویو کی ڈیٹ آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ بس اس بار متزلزل ہوئی تھی، لیکن جب اس چیز سے نکل آئی تو آگے کوئی رکاوٹ ہو۔ ہو ہی نہیں سکتا۔

ناممکن۔

پیپرز سے لے کر زین کی ڈلیوری تک وہ محسنہ کے ساتھ اوپر شفٹ ہو گئی تھی۔ اس پر چاروں جانب سے پتھر برسائے جا رہے تھے۔ سخت ترین رویہ۔ بڑے ماموں ڈھال بنے کھڑے تھے تو چھوٹے ماموں قطعاً" خاموش تھے بالکل پتا نہ لگتا۔ وہ کس پارٹی کی جانب ہیں۔ مامیاں خاموش تھیں لیکن جب رشتے والی ماسی نے نازیہ کے حوالے سے بتایا۔

"رشتے تو دو ایک میری نظر میں ہیں مگر اس شجرۃ والے واقعے کی دھول بیٹھ جائے تو بات بڑھاؤں میں۔"

تب پہلی بار مامی نے شدید ترین نفرت کے ابال اپنے اندر اٹھتے محسوس کیے۔ شجرۃ الدر نے کبھی کسی کی "بات" نہیں سنی تھی۔ وہ بہت ساری باتوں کے جواب میں ایک منہ توڑ جواب دے سکتی تھی۔ وہی جواب اور جواز۔۔۔ جو سنان الیاس نے اسے دیا تھا کہ "کیا ہوا ہمارا نکاح ہو چکا ہے، کوئی گناہ تو نہیں" اور تب یہ یقین دہانی اتنا ہلکا پھلکا کر گئی تھی کہ پچھتاوے کا احساس جاتا رہا، لیکن اب۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر یہ جملہ کہہ کر اگلے کا منہ بند کر دیتی، لیکن جواب زبان کی نوک پر آکر گم ہو جاتا۔

مامی اس جملے کے جواب میں اتنا لمبا اور کھلا ڈالا پیراگراف سنانا شروع کر دیتیں جو کانوں کی لوؤں کو دہکا دیتا تھا۔

اور شجرۃ الدر کی فطرت میں بہت سی خوبیاں تھیں اور خامیاں بھی۔ وہ ذہین تھی، محنتی تھی۔ وہ بہت مضبوط قوت ارادی بھی رکھتی تھیں۔ اسے ڈٹ جانا آتا تھا ہار ماننا فطرت میں تھا ہی نہیں۔ حالات کو اپنے تابع کرنا بہت پہلے سیکھا تھا۔ ہاں شجرۃ الدر۔۔۔ اس نے عرصہ ہوا، خود کلامیاں کرنا چھوڑ دی تھیں، مگر اس نے خود کو بہت تسلی سے سمجھایا تھا۔

"تم پیچھے نہیں ہٹو گی، کامیابیوں کی راہوں میں رکاوٹیں آیا ہی کرتی ہیں اور یہ تو بس صبر کا امتحان ہے، ظرف کا امتحان۔۔۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا، دنیا جو مرضی کہتی رہے وہ پیچھے نہیں ہٹے گی کبھی بھی۔۔۔"

اور پھر اس نے امتحان دیا۔ رات گئے تک کمرے کی بتی جلتی رہتی۔ اس نے شان دار نمبروں سے کامیابیاں حاصل کی، دنیا انگشت بدنداں تھی۔ سنان کا اس گھر میں داخلہ بند تھا، مگر وہ اس کی جانب سے غافل نہیں تھا، پل پل کی خبر رکھتا۔۔۔ بے چین رہتا۔ شجرۃ الدر نے خوف کی چادر کو اتار پھینکا تھا۔ اس نے خود سے ہم کلام ہو کر خود کو بتایا تھا جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ اس لیے۔۔۔ زین سنان کی پیدائش کے ہفتے بھر بعد وہ انٹرویو

کے لیے تیار تھی۔

اور اس نے انٹرویو پاس کرلیا۔ اسے جیت کا یقین تھا۔ وہ اتنی ہلکی پھلکی اور بااعتماد تھی کہ اسے خود اپنے آپ پر حیرت تھی۔

آئی کیو لیول۔۔۔ میڈیکل اور سائیکالوجیکل ٹیسٹ اس نے سب میدان مارلیے۔

ایسے میں راتوں کو گلا پھاڑ کر روتا زین سنان اسے بس حیران کرتا تھا اور وہ بس یہی سوچتی کہ یہ کہاں سے آگیا تھا۔

بہت سارے سوالات منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ اب آگے کیا ہوگا؟ کیا کرنا چاہیے؟ شجرۃ کو جیسے بچے سے دلچسپی ہی نہ تھی اس کی دلچسپی کے اور بہت سے کام تھے جو سر اٹھانے کی مہلت نہ دیتے۔ وہ ہر قدم کامیابی کی جانب تھی۔

اور محسنہ سوچتی تھیں بس وہ فوراً" شادی کرلیں تاکہ سنان کے منصوبے کے مطابق وہ زین کے ہمراہ اس گھر اور محلے سے چلی جائیں۔

لیکن شادی۔۔۔

☼ ☼ ☼

شجرۃ کے پلان میں ابھی تک شادی کی جگہ نہیں تھی۔ اسے نو ماہ کی بنیادی ٹریننگ کے لیے جانا تھا۔

پھر دو سال کی ڈیپارٹمنل ٹریننگ کے لیے لاہور جانا ہوگا۔ سول سروسز اکیڈمی لاہور۔

اکیڈمی کی جانب سے کمرہ الاٹ کیا جائے گا اس سب کے بیچ۔۔۔ شادی۔۔۔ دماغ خراب ہے کیا؟

وہ سترہ گریڈ کی آفیسر بنے گی۔ نیکسٹ پروموشن کے لیے پانچ سال تک جاب کرنا ہوگی۔ گریڈ اٹھارہ ہوجائے گا۔

دو سال بعد نیپا کا کورس اور گریڈ بیس۔

شادی ابھی کیسے کی جاسکتی ہے؟

شجرۃ الدر نے سنان کے ساتھ مل کر سب طے کرلیا تھا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد شجرۃ کی کامیابیاں سنان کے لیے سب سے بڑی خوشی تھی۔

ایک لڑکی جس کے اعتماد نے اسے چونکایا تھا۔ اس وقت جب وہ اپنا اعتماد کھوچکا تھا۔ لائم لائٹ سے یک دم ہٹ جانے کے باعث۔ وہ دن بدن احساس کمتری کا شکار ہورہا تھا۔ نرمین کے جملے اعصاب پر کوڑے کی طرح برستے تھے وہ خود کو ناکارہ محسوس کرنے لگا تھا لنگڑاتی ٹانگ کے ساتھ۔ وہ سوچتا اب شاید کبھی کسی مقام پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ مگر شجرۃ الدر کا سر کو بھری کلاس میں اپنی کمتری اور مجبوری کا بتانا وہ حیران رہ گیا تھا اور نجانے کیوں اس کا مددگار بننے کی خواہش پیدا ہوگئی اور پھر جب دوستی ہوگئی اور وہ ہر بات کے لیے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اسے کچھ ماننے لگی۔ اس کی رائے کو اولیت دینے لگی بلکہ اولیت بھی کیا وہ وہی کرتی تھی جو وہ کہہ دیتا تھا۔ شجرۃ الدر کے ساتھ نے اس کے کھوئے اعتماد کو بحال کرنا شروع کردیا یہاں تک کہ وہ خود بھی اپنے اس "لنگ" کو دیکھنا بھول گیا وہ "لنگ" جسے شجرۃ الدر جیسی لڑکی نے کبھی دیکھا ہی نہیں وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ مگر اظہار سے پہلے وہ خود اپنے آپ سے اقرار کرنے سے۔۔۔ کتراتا رہا اگر جو اس نے اور آگے اس کا ذہن خالی ہوجاتا تھا۔

لیکن شجرۃ نے خود ہی سارے سوال جواب نبٹا دیے۔

نرمین کے انکار سے زیادہ نرمین کے جملوں نے دکھ پہنچایا تھا اور شجرۃ کے اقرار نے۔۔۔ جو خوشی دی تو دراصل وہی اصل بات تھی۔

وہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا تو اتنا بے خبر بھی نہیں تھا کہ نہ جان پاتا۔ وہ اس سے کس قدر عشق کرتی ہے وہ خود کو اس کا مجرم مانتا تھا۔

اس نے دل کو بارہا تسلی دی تھی کہ جو بھی ہوا وہ غلط نہیں ہوا' ان پر کوئی حد نہیں لگائی جاسکتی' لیکن اب سوچتا تھا' دنیا کو۔۔۔ اپنے بہن بھائیوں کو بھی کیا اسی طرح سینہ ٹھونک کر بتا سکے گا اور اگر بتادے تو نتیجہ۔۔۔؟ اف۔۔۔

باقاعدہ شادی بھی کرلیں گے ہم۔۔۔ بچہ۔۔۔؟

وہ بہت مشکل سے موقع نکال کر فقط تین بار بچے

سے مل سکا تھا اور جتنا وہ اس کی پیدائش سے پہلے کے حوالے سے ذمہ دار تھا اسے سامنے دیکھ کر بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اسے "محبت" کا نام دیا تھا مگر وہ اپنے دل کو کسی بھی جذبے سے خالی دیکھ کر ششدر تھا اور پھر جب اس نے خود کو ٹٹولا تو اندر صرف ایک جذبہ ترحم تھا۔۔۔ بے یقینی اور۔۔۔ اور شرمندگی۔

وہ اس کی جائز اولاد تھا' مگر کیسی جائز۔۔۔ جس سے ملنے وہ چوری چھپے آیا تھا۔ وہ شرمسار یک ٹک بچے کو دیکھتا تھا اور شجرۃ کو جیسے پتا ہی نہ ہو کہ کمرے میں موجود اس بچے سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔۔۔ بے نیاز۔۔۔ مگن۔

وہ اس کی قلقاری پر کبھی سرشار نہ ہوئی۔ اس کے رونے نے بھی اس کے دل کو نہیں نچوڑا۔ وہ مسلسل شور پر بس ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی اور تاثر یوں ہوتا کہ سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ وہ اس کے لیے کیا کرسکتی ہے؟ وہ کیوں روتا ہے' وہ کیوں ہے۔۔۔؟ کیوں۔۔۔ اور ایک انجانی' ناقابل فہم سی لاتعلق کیفیت کے باوجود سنان الیاس شجرۃ الدر سے اس معاملے کو سلجھانا چاہتا تھا۔ خود کو نکالنا چاہتا تھا اور محسنہ کو۔۔۔

محسنہ ان کے جائز بچے کو ناجائز بچے کی طرح اوپر چھپائے پھرتیں۔ جو جگر چھلنی کرتے جملے سنتی تھیں۔ استہزائیہ نگاہوں کے وار سہتی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح باورچی خانے میں آتی تھیں فیڈر میں دودھ میں چمچ گھماتے ہوئے مقدور بھر کوشش کرتیں کہ آواز پیدا نہ ہو اور آواز تو وہ اس کے رونے کی بھی بند کرلینا چاہتی تھیں۔ رونا جس کا مشغلہ تھا۔ زین میں دو ہی باتیں تھیں ایک وہ روندو تھا۔ دوسرا موٹو۔۔۔ آٹے کا تھیلا۔ محسنہ نانی تھیں انہیں پورے جہان سے پیارا لگتا۔ شجرۃ سے بھی پیارا۔۔۔ مگر انہیں اس پر ترس بھی ساری دنیا سے زیادہ آتا تھا' اتنا ترس کہ آنکھ ہر وقت نم رہتی۔ اسے چپ چاپ دیکھتیں۔۔۔ خاموش طبع تو پہلے ہی تھیں۔۔۔ اب تو جیسے زبان رہن رکھوادی اس کے کام کرتیں کام بھی کیا خوب۔۔۔ کپڑے دھوتیں تو لنگوٹ اندر کمرے میں سکھاتیں کہ اپنے گھر کی چھت سے اونچے بھی کچھ گھر تھے اور ان کی کھڑکیوں بالکونیوں سے عورتیں اشارے کرتیں تار پر سوکھتے چھوٹے کپڑے۔۔۔ سکھانے کی عجلت میں استری پھیرتیں پھر جھٹک جھٹک کر بھاپ نکالتیں۔

ایک عالم کو زین سنان کی پرواہ تھی۔ وہ کب سوتا ہے' کب اٹھتا ہے' ساتھ والے پڑوسیوں کی بوڑھی ساس رونے کی مسلسل آواز پر صدا لگاتیں۔

"اے محسنہ! بھول گئی کیا بچہ پالنا۔" پھر پوپلی آواز میں ہنستیں۔ "نانی بننا۔ ماں بننے سے مشکل کام ہے بھئی۔"

جوان العمر مائیں گلی سے گزرتے صدا لگاتیں۔

"محسنہ خالہ! منے کو ٹیکے کے لیے نہیں لے جاؤگی؟"

"پولیو کے قطرے پلوالو۔" آفاق نے گھر کے باہر پولیو ٹیم کی چاکنگ کو دیکھ کر جو حشر اٹھایا' اس کو سوچ کر ہی محسنہ کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔

ایک عالم کو منے کی فکر تھی' نہیں تھی تو شجرۃ الدر کو۔۔۔ یہ فقط آگے بڑھنے کا وقت تھا۔ پیچھے مڑ کے دیکھنے کا نہیں۔۔۔ کجا کہ ٹھہرنا۔

لیکن ایک اور وجود بھی تھا جو ٹھہرتا تھا۔ ٹھٹک جاتا اور مچلتے دل۔ بڑھتے قدموں کو دماغ کی کوئی تنبیہہ نہیں روک پاتی تھی اور یہ تھیں ہما بھابھی۔۔۔

جنہیں روتی آواز دل پر وار کی طرح لگتی۔۔۔ بے چین کرتی۔ انہیں امنڈ امنڈ کر منے پر پیار آتا تھا۔۔۔ اس کو خود میں بھینچ لینے کی خواہش ساری رات بستر پر کروٹیں بدلواتی۔۔۔ وہ چھپ کر سب کی نگاہوں سے بچ کر اسے ایک نظر دیکھنے' ایک بار آغوش میں لینے اور بس چوم لینے کے لیے اوپر پہنچ جاتیں۔

اگر یہ منا ان کا ہوتو۔۔۔؟

اور جس دن آفاق نے انہیں دیکھا اور خواہش آنکھوں سے پڑھ لی۔

اس روز۔۔۔ وہ کسی جنونی کیفیت میں زین سنان کو خود میں بھینچ کر بے تحاشا چوم رہی تھیں۔ "میلا گندا۔۔۔ میرا پالا بچہ۔۔۔ آپ تو میرے اچھے بیٹے ہو ہجھ کو ممی امی بولو۔۔۔ اچھا ابھی نہیں آتا بولنا۔ ہیں ہیں۔۔۔ ارے

"ہائے۔"

"تجھے بڑے ارمان آرہے ہیں امی بننے کے۔ہیں!" آفاق بھائی نے ہما بھابھی کو گدی سے پکڑا تھا۔وہ کسی جنونی کیفیت میں گھر گئے تھے۔ہما بھابھی کے لہجے کی تڑپ' حسرت' تشنگی' بے قراری' چومنے میں وہ پاگل پن۔۔۔ انہیں تازیانے کی طرح لگا۔

ہما کی چولی چھوڑی تو۔۔۔ منے کو ایک ہاتھ میں اٹھالیا۔وہ اسے پھینک دینا چاہتے تھے' جہاں بھی جاکر لگے۔ چھت پر لگے پنکھے سے ٹکرا کر چیتھڑے بن جائے یا دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش یا پکے فرش پر گر کے ریزہ ریزہ۔

محسنہ نے بس آفاق کے اٹھے ہاتھ میں منے کو دیکھا تھا۔وہ "نہیں" چیختے ہوئے بھاگی تھیں۔رستے ہی میں پاؤں رپٹ گیا انہیں چارپائی کا کونہ لگا تھا یا دل خوف سے بند ہوا تھا۔پتا نہیں لگا۔

صبح دس بجے فوت ہوئی تھیں۔رات دس بجے تک لوگ دفنا کر بھی آگئے۔

☼ ☼ ☼

سنان کا داخلہ بند تھا' لیکن بڑے ماموں نے اسے بلوایا تھا۔وہ افتاں وخیزاں آیا تھا جینز کے فولڈ پائنچے موڑے ہوئے کف۔ سر پر بندھا رومال۔۔۔ وہ محسنہ کا محرم تھا۔گھر سے اٹھانے سے لے کر جنازے تک اور پھر لحد میں اتارنے تک کے مرحلے میں سب سے آگے تھا۔کندھے بدلنے کے عمل میں جب ایک بار آفاق اور وہ برابر آگئے تو آفاق کی نگاہوں میں اترا خون۔۔۔ وہ دونوں آگے کی جانب تھے۔ آفاق نے بمشکل برداشت کیا تھا۔اگلی بدلی میں وہ قطار سے دور ہو کر سب سے الگ تھلگ چلنے لگے۔

ماں کی ایسی موت۔صدمے سے بڑھ کر حیرانی تھی ابھی صبح تو۔۔۔ وہ زین کے ساتھ کھیل رہی تھیں اور زین۔۔۔ ارے! اسے کہیں رات گئے اس بچے کا خیال آیا۔اس کے وجود کا احساس تک نہ تھا' پہلی بار اس کا دل مسلا وہ کسی سے کچھ نہ بولی مگر متلاشی نگاہیں۔

"شش۔۔۔!" ہما بھابھی کی انگلی اپنے ہونٹوں سے جڑی تھی۔"وہ ادھر ہے' سو رہا ہے۔"

"صبح سے سو رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے اسے سونے والی دوائی چٹا دی تھی' میرے کمرے میں ہے۔"

"اور۔۔۔ اور آفاق بھائی؟"

"وہ آج مردوں کے ساتھ پڑوسیوں کی بیٹھک میں سو رہے ہیں' گھر بھرا ہوا ہے نا' دور نزدیک کے سب رشتے دار۔۔۔"

اور صبح تک نئی کہانی "انجان لوگوں" کی زبان پر تھی نجانے کس نے گھڑی۔۔۔ سنائی اور پھیلائی۔

"ہما نے بچہ گود لیا ہے نا۔"

تردید کا موقع ہی نہ بن سکا۔ آفاق ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

ہما کے بچے کو گود لینے والی بات سنان الیاس کی آپا نے سنی تھی پھر انہوں نے بچے کو دیکھ بھی لیا۔

ڈرتے ڈرتے چھوا' پھر محتاط روی سے گود میں بھرلیا۔اس کی صورت اتنی موہنی تھی اور وہ دل میں اس طرح گھس رہا تھا کہ دل پانی پانی ہو رہا تھا۔

اسے آغوش میں بھینچتے ہوئے انہیں پتا ہی نہ لگا کب آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا' وہ اتنا اپنا کیوں لگتا تھا۔

شاید بے اولاد ممتا کو قرار مل رہا تھا۔انہوں نے خود کو باور کرایا۔

بچے کو چومتی تھیں تو ایک مانوس خوشبو دل ودماغ کو معطر کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں اسے گود لینا چاہتی ہوں شجرۃ! تم ابو سے بات کرو نا۔ آفاق ان کی بات مان لیں گے۔۔۔ وہ مجھے باہر سے بھی کسی کا بچہ نہیں لینے دیتے' نہ کہیں اور سے کہتے ہیں۔ نجانے کس کا۔۔۔ شجرۃ! یہ تو تمہارا اپنا ہے نا۔ قسم سے میں اسے اپنے دل سے لگا کر رکھوں گی۔اور پھر تم اسے کیسے پالوگی۔۔۔ تمہیں تو ابھی بہت سے امتحان پاس

کرنے ہیں۔ٹریننگ پر جانا ہے۔"

"آفاق بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔" بھابھی جو کہہ رہی تھیں۔ شجرۃ وہ سب سوچ سوچ کر ہلکان ہو چکی تھی۔(ہاں اگر ایسا ہو جائے تو۔۔۔ اور۔۔۔ سنان۔۔۔ وہ اس کی بات کو کبھی نہیں ٹال سکتا)

اور یہ ہما بھابھی کی خام خیالی تھی۔ آفاق تو اس کا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے۔انہوں نے کہا کہ "وہ گلی سے کتا لے کر پال لیں گے مگر۔۔۔"

کتے والی مثال پر بڑے ماموں لرز کر رہ گئے۔ نجانے کیسے طاقت سی آگئی اپنے ہی بیٹے کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔

"اسی لیے تجھے اللہ نے اولاد نہیں دی کم ظرف! کہ تجھے۔۔۔ کتے کے بچے اور انسان کے بچے کا فرق نہیں معلوم۔"

"ہاں ہاں۔اب ایک آپ ہی رہ گئے تھے مجھے طعنے دینے کو۔ نہیں ہوں اس قابل۔"

جیسے کسی نے بھس میں چنگاری ڈالی۔ شعلے تھے آسمان کو چھوتے تھے وہ قیامت کا رن کہ بس! وہ ہما کو بھی کوٹ رہے تھے اور گھر کے درودیوار کو گھر ہی کی چیزوں سے توڑ دینے والے تھے۔ شجرۃ کو سنان سے ملنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

یہاں سنان کے پاس ایک اور نئی کہانی تھی۔۔۔ ماں مر گئی تھیں اور باقی بہن بھائی اپنی زندگیوں میں بری طرح مگن تھے۔سنان کی آپا دل کا حال کس سے کہتیں۔۔۔ بے اولادی کا دکھ۔۔۔ وہ سنان کے آگے ہی رو پڑیں۔

"جہاں سے شجرۃ کی بھابھی نے اتنا پیارا بچہ لیا ہے مجھے بھی دلوا دو سنی۔۔۔! نام نسب معلوم ہو۔۔۔ بس یتیم' لاوارث۔۔۔ مجھ سے اب اتنی خالی زندگی برداشت نہیں ہوتی۔ تمہارے بھائی کسی ادارے سے لینے نہیں دیتے ہیں۔ ہمیں کیا پتا۔ بتانے والے سچ کہہ رہے ہیں یتیم ہے یا کسی کے گناہ کی؟ سنی! بچہ تو بچہ ہوتا ہے نا۔ جب میں اسے گود لوں گی تو میرا ہوگا نا۔ تمہارے بھائی کے خاندان میں بچے پہلے ہی کم ہیں۔ مجھے کیوں دیں گے؟"

ارمان کی بیوی کہنے لگی "ہماری تو یہی فیملی ہے۔ ایک بچہ۔ ایک بچی۔ مزید کا ارادہ ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ تم اپنے دو ہی رکھو۔ ایک مجھے پیدا کر کے دے دو تو کہتی ہے کیا گارنٹی ہے۔ بیٹا ہو گا اور بیٹی ہو گئی تو آپ تو خیر سگی پھوپھی ہوں گی۔ پھوپھا سے کیا رشتہ۔ اور پھر ہنس پڑتی ہے اور سچ ہے کون دیتا ہے کسی کو بچہ۔ لیکن بس۔۔۔ لیکن سنی! تم مجھے بھی وہیں سے بچہ لا دو جہاں سے ہما لوگوں نے لیا۔ ہیں! سنی لادو گے نا؟"

وہ تیز تیز بول رہی تھیں۔ روتی جاتی تھیں اور آخر میں ملتجی لہجے میں دونوں ہاتھ تھام کر گڑگڑانے لگیں۔

"اور اگر وہی لادوں تو۔۔۔؟" سنان کے لبوں سے پھسلا۔

"وہ۔۔۔ وہ کیسے؟ وہ تو ہما کا ہے نا۔ بس اس جیسا لادو۔ میرا' میرا دل کرتا تھا سنی! اپنا سینہ کھول کر اسے کہیں اندر چھپالوں۔ کسی کو دکھائی نہ دے۔ پتا نہیں کیوں ایسا ہوا۔ پہلے تو کبھی نہ ہوا۔"

اور سنان الیاس ایک مشکل ترین مرحلے سے نکل سکتا تھا۔ اس نے شجرۃ الدر کے بلاوے پر یہ سمجھاؤ اس کے سامنے رکھا جو نا سمجھی کے عالم میں سب سن رہی تھی اور جب سب سمجھ میں آیا تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی۔ وہ جوش میں کھڑی ہو گئی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے دے دینے کا اشارہ کر رہی تھی۔ "دے دو۔۔۔ دے دو سنان! دے دو وہ تمہاری آپا ہیں۔ فکر کی کیا بات۔"

"لیکن!" سنان کے چہرے کی سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔ "آپا کو پھر سب بتانا پڑے گا۔"

شجرۃ پل بھر کو ٹھٹکی۔ "بت۔۔۔ بتا دینا صرف آپا کو۔۔۔"

اور آپا کی نظروں میں ہفت آسمان گھوم گئے تھے۔

"امی بھی جانتی تھیں۔"

"امی جانتی تھیں؟" آپا نے اس کے الفاظ سرگوشی میں دہرائے' ان کا چہرہ حیرت کی زیادتی سے اس قدر بگڑ

www.paksociety.com

گیا تھا کہ پہچانی نہ جاتی تھیں۔ سنان نے خود کو لعنت کے حرف کے لیے تیار کرلیا مگر جب آپا بولیں۔۔۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جھنجھوڑنے کے سے انداز میں اس کے دونوں شانے تھام لیے تھے۔

"ت تو پھر وہ۔۔۔ وہ ہما کے پاس کیوں ہے؟ مجھے۔۔۔ مجھے لا کر دو۔ وہ تو پھر میرا ہوا نا۔ تم نے ہما کو کیوں دے دیا؟" سنان کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ آپا نے ٹھوڑی پکڑ کے چہرہ روبرو کیا۔ وہ نیچے بیٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔ وہ اتنی ارزاں، اتنی فقیر اور حقیر لگ رہی تھیں کہ سنان کا دل پانی ہونے لگا۔

"میں نے نہیں دیا۔ وہ تو محسنہ آنٹی کی وفات۔۔۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بس وہ چاہیے۔۔۔ سنی! تمہارا ہوا تو میرا ہوا نا۔ تم اور میں کوئی دو ہیں۔۔۔ ہیں؟"

سنان کی گردن بے ارادہ نفی میں ہل گئی۔ آپا اور وہ دو ہو بھی کیسے سکتے تھے اور آپا اس سوال تک تو پہنچی ہی نہیں تھیں کہ۔۔۔ وہ کہاں سے آگیا۔ کیوں؟ اور کیسے؟ کسی کو بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ خود دو بار جا کر شجرۃ سے ملی تھیں حساب جوڑا جائے تو وہ اس وقت یقیناً" حاملہ تھی مگر پتا ہی نہ چلا۔ چائے پانی محسنہ اور ہما نے سامنے رکھا تھا۔ شجرۃ سارا وقت بیٹھی ہی رہی۔ ہاں محسنہ نے بخار کا بتا کر آرام کرنے کا بتایا تھا تو۔۔۔ یعنی کہ اس وقت۔۔۔

"لیکن دفع کرو۔۔۔ انہوں نے جڑتی کڑیوں کا سرا چھوڑ دیا۔ اہم یہ نہیں تھا کہ کب؟ کیوں؟ اہم یہ تھا کہ وہ ہما کے پاس کیوں تھا۔ اسے تو ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ وہ بے تابانہ سنان پر زور دینے لگیں۔ ان کی زبان اور ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھ پکڑ پکڑ کر بس جلد از جلد بھیجنا چاہتی تھیں فوراً"۔۔۔

"بھائی صاحب ایک غیر بچے کو کیوں پالیں گے؟" اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔

"غیر کیوں؟" آپا تڑپ اٹھیں۔ "میرا بھتیجا ہے وہ۔۔۔"

"یہ سارا واقعہ کوئی نہیں جانتا آپا! اور جو نہیں جانتے وہ نہ ہی جانیں تو۔۔۔"

آپا چونکیں۔ جذباتی جنون سے ذرا سا ابھریں۔ ہاں وہ کیا کہیں گی؟ ان کے میاں تو کبھی بھی ایسے ویسے بچے کو گھر میں نہ گھسنے دیں گے۔

"ہم۔۔۔ ہم صرف انہیں بتا دیں گے، وہ تو بہت خوش ہو جائیں گے سنی!" آپا میں دوبارہ جوش بھرا۔ "وہ تو میرا اپنا خون ہے نا سنی۔" وہ جھکے چہرے کو پکڑ پکڑ کر اپنی جانب متوجہ کرتی تھیں۔ نڈھال، خاموش پژمردہ سی آپا بے حد تازہ دم لگتی تھیں۔

"میرے ہاں پیدا ہوا یا تمہارے ہاں، اس میں کیا فرق ہے بھلا۔ تم تو میرا اپنا خون ہو نا۔"



اور زین سنان۔ محسنہ کے بعد صرف ہما کی آغوش کے لمس سے واقف تھا۔ شجرۃ کے بارے میں تو کوئی خبر رکھتا ہی نہ تھا۔ سو جب آپا اور سنان اسے لینے آئے تو۔۔۔ وہ ہما کی گود سے نکلتے ہی بلک بلک کر رونا شروع کر دیتا اور اس سے بڑھ کر ہما روتی۔ زین کا رونا دل کو اتنی تکلیف دینے لگتا کہ طوعاً" و کرہاً" ایک بار ہما کی جانب اسے بڑھا دیا جاتا۔ شجرۃ کا کردار یہاں ایک تماش بین کا سا تھا۔ ماں مر گئی تھی اور جیسے اب یہاں اس کے رہنے کا جواز بھی ختم ہوا۔ (آفاق رہنے دے بھی نہیں رہا تھا۔ ماموں بھی اب کی بار چپ تھے)

زین سنان پھوپھی کے گھر چلا جاتا تو شجرۃ آرام سے اپنے ٹارگٹ کی طرف قدم بڑھاتی۔ زندگی کے اگلے صفحات پر کاتب تقدیر نے کامیابی لکھ کر نیچے مہر بھی لگا دی تھی اور یہ بات شجرۃ الدر جان گئی تھی۔

بحیثیت ماں زین سنان اس کا سنگھار تھا، لیکن جب اس نے اسے گلے کا ہار نہ بنایا تو پیر کی زنجیر کیسے بننے دیتی؟

کبھی ہما کی گود۔۔۔ کبھی آپا کی۔۔۔ کب تک چلتا یہ تماشا؟

گھر کے بڑے دی اینڈ کے منتظر تھے کہ جو بھی ہو

ایک کنارہ تو ملے۔ ایک کہانی کا منطقی انجام۔۔۔ ہاں بس یہاں سے نکلا جائے۔ سنان سوچ رہا تھا۔

آپا بچے کو جھپٹ کر پیچھے مڑے بغیر سرپٹ دوڑ لگا دینا چاہتی تھیں مگر تب ہی خیال آتا۔ ہما بھی تو ماں ہے نا۔ وہ خود سے ہی بچہ دے دے۔

دو بندے اور تھے جن کی جلدی کی خواہش سب سے زیادہ تھی۔ ایک شجرۃ الدر اور ایک آفاق بھائی۔۔۔

تماشا تو پھر رات بھر چلتا رہتا۔ ہما کے اندر بچہ دینے کی ہمت نہیں تھی اور باقی سب مروت آخر کب تک نبھاتے۔

ساری رات ہما ان کی اور دیگر اہل خانہ کی منتیں کرتی رہی۔ روتی اور آفاق کے تھپڑ کھاتی رہی۔ کھاتی اس لیے رہی کہ پہلے ایک تھپڑ کے بعد بھیگی بلی بن جاتی تھی۔ دبک جاتی۔ لب سی لیتی مگر جب یہ احساس ہوا کہ صبح یہ بچہ۔۔۔ چلا جائے گا، وہ روتی تھی۔ پٹتی تھی ضد سے پیچھے نہ ہٹتی تھی۔ اسے یہ بچہ چاہیے ہی تھا، مگر۔۔۔

آفاق کی ضبط کی حد ختم ہو گئی۔ وہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھے۔۔۔ زین سنان کو ان کی گود سے جھپٹ لیا۔ آپا کی گود میں ڈال کر ہاتھ کے اشارے سے نکل جانے کو کہا۔ دوسرے بازو کو دروازہ سے لگا کر باہر کو لپکتی ہما کی راہ کو مسدود کر دیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو ہما غش کھا کر گر گئی۔ شجرۃ الدر نے اوپر کی جانب قدم بڑھائے۔ اسے اپنی تیاریاں کرنی تھیں۔

آفاق نے دروازہ بند کر کے ہاتھ آپس میں مسل کر جھاڑے۔

"خس کم جہاں پاک"

وہ جو ایک مبہم سا دھتکارے جانے کا احساس زین سنان کو ہوتا تھا۔ وہ یونہی فالتو کا وہم تھوڑا ہی تھا۔



زین سنان کی آمد نے جہاں آپا کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا وہیں ان کے سسرال کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اتنی حیرت کہ اپنی ہی انگلیاں دانتوں میں چبا کر یقین کی کوشش کریں اور ہر بار کریں؟

پورا سسرال مگر خاص طور پر نندیں۔۔۔ اور پھر امی ابا (ساس سسر)

بہو ماں نہیں بن سکتی تھی تو دوسری کر لیتا نا۔۔۔ خرابی بیٹے میں تو نہ تھی نا۔ اب ہم کیسے لاڈ کریں۔۔۔ اللہ جانے کس کا بچہ ہے کہاں سے اٹھا لے آئے۔ توبہ توبہ۔۔۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا حسین کو۔۔۔ سارے طور طریقے، اصول حکم۔ شریعت سب بھول بیٹھا۔ اور سب سے اہم سوال یہی تھا۔

آپا اتنے سال سے علاج کروا رہی تھیں۔ حسین نہ تو دوسری شادی پر راضی ہوتے کہ ماں خوش ہو نہ آپا کی یہ مانتے کہ کسی کا بچہ گود لیا جائے ایک قطعی جواب۔ "ہو گا تو تم ہی سے۔۔۔"

اور بہت رونے پیٹنے پر محرم نامحرم، حکم شریعت، باپ کا نام، روز حشر ماں کا نام پکارا جائے گا بتا کر آپا کی بولتی بند کر دیتے اور مذہبی رجحانات کے حامل سسرال میں رہ کر۔۔۔ کچھ اولاد کی دوری کے باعث آپا ذاتی حیثیت میں بھی مذہب کے نزدیک تھیں، کوئی نہ بھی بتاتا تو گود لینے والے سب احکام سے واقف تھیں۔

اور یہی وہ سوال تھا جو سب کو کھٹکتا تھا۔ حسین نے بیوی کے عشق میں احکام شریعت بھی بھلا دیے۔

نجانے کس کا لڑکا اٹھا کر لے آئی وہ۔۔۔ بھلے بہت چھوٹا سا ہے، پالنے میں۔۔۔ لیکن کل کو بڑا بھی تو ہو گا اور بھابھی اسے نہلاتی ہے اور بستر میں ساتھ سلاتی ہے۔ منہ سر تو اتنا چومتی ہے کہ پنسل سے بنے ہوتے تو اب تک مٹ جاتے یا گھس جاتے۔ پیار میں ایسا والہانہ پن۔ کہ جو انہیں اپنی خود کی پیدا کی ہوئی اولادوں سے بھی شاید محسوس نہ ہوتا تھا اور بھائی حسین یہ سب دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ جو ان لوگوں میں سے ہے، جو سات برس کے بچے کا بستر الگ کر دیتے ہیں اور بارہ کے بعد بغیر دستک کے اندر آنے پر کوٹ دیتے ہیں۔

زین بھائی بھابھی کا گود لیا بچہ تھا نا کہ ان کا اپنا خون۔۔۔ انہیں اس پر کیوں خوامخواہ میں پیار آتا؟ دماغ

خراب ہے کیا؟ عجیب چڑ ہوتی تھی اسے بھائی کے گھر کا اکلوتا لاڈلا بچہ بنے دیکھ کر۔۔۔ اس کے بہترین لباس' خوراک اور بے حد خوب صورتی' صحت مندی۔۔۔

بچے کے حوالے سے سب کا رویہ اور سوچ ایسی ہی تھی' مگر آپا کی چھوٹی نند کا انداز سب سے جارحانہ تھا وہ گھر میں چھوٹی تھی اور یہ ڈیمانڈ کرتی تھی کہ اسے ہی سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور جب بچوں والی ہوئی تو یہ مطالبہ اپنے بچوں کے لیے سوچنے لگی جبکہ آپا کو زین کے علاوہ اب دنیا میں اور کوئی نظر آتا ہی نہ تھا۔

حسین بھی خاموش تھے۔ مطمئن تھے' بیوی سے واقعی محبت تھی اور یہ سوچ بھی کہ خرابی اگر ان میں ہوتی؟

بچہ بہت خراب صورت حال میں دنیا میں آیا تھا' مگر جائز تھا' پھر بیوی کا اپنا خون تھا۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور دین کی راہ پر چلنے کا وہ صرف پرچار نہیں کرتے تھے۔ اس کی روح کو سمجھتے ہوئے عمل کی کوشش بھی کرتے تھے۔ فطرتاً" چغل خور یا عیب جو نہیں تھے اور اللہ عیب پوش ہے اور عیب پوشی ہی کو پسند کرتا ہے۔

وہ اپنے اہل خانہ کے ڈھیروں سوالوں کے جواب میں ایک چپ کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ انہیں کسی بھی حال میں مناسب نہ لگا کہ وہ بتاتے بچہ کہاں سے آیا۔ بس ان کا اپنا دل مطمئن تھا تو کافی ہے

اور حسین کا یہی رویہ سب کو اصل آزار پہنچاتا تھا خصوصاً" چھوٹی والی کو۔۔۔ سب مصلحت آمیز لہجے میں ناگواری کا اظہار کرتے' وہ برملا۔۔۔

پھر کچھ بڑا ہونے پر اس کی ذہانت بھی نمایاں ہوتی گئی اور خوب صورتی اور نقوش کی وضاحت۔۔۔

وہ عام بچوں کی نسبت زیادہ ذہین تھا اور بہت خوب صورت مگر۔۔۔ نقوش۔۔۔ نقوش۔۔۔ چھوٹی آنکھیں چندھی کرکے اسے بغور دیکھتی اور گھنٹوں سوچتی مگر کوئی سرا نہ ملتا۔

اس کی آنکھوں کی بناوٹ۔۔۔ کالی' سیاہ گھور' اداس تاثر۔۔۔ ذہانت سے پُر۔۔۔ گہری اور باقی تمام چہرہ اور رنگ۔۔۔ اسے لگتا' اس نے یہ چہرہ پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔

مگر کہاں کب۔۔۔ یہ گتھی کبھی نہ سلجھا سکی۔

☼ ☼ ☼

یہ زین سنان کو اتنی محبت سے پالنے کا انعام تھا کہ جب وہ اپنی خود کی اولاد کی طلب کو بھول بیٹھی تھیں۔ تب اللہ نے انہیں سبطین سے نواز دیا۔ اب وہ دو بیٹوں کی ماں کہلائی جائیں گی' مگر۔۔۔

اٹھنے والا نیا شوشا۔۔۔ مدلل اعتراض۔ اب تو ان کی اپنی گود ہری ہے تو کیوں پرائی اولاد پر وقت ضائع کیا جائے۔ وہ منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھیں' مگر اس بار حسین بھی سب کے ہم خیال نکلے۔ آہ۔۔۔ ایک بہت بڑا ہنگامہ۔۔۔ اور پھر

بچہ واپس کر دیا گیا' جہاں سے لایا گیا تھا۔

اس کے آنے سے زیادہ اس کے چلے جانے نے حیران کیا تھا۔ وہ آخر آیا کہاں سے تھا اور بھابھی جو اس پر اپنی جان وارتی تھیں' اتنی مطمئن کیسے ہیں۔ سب بھول بھال گئے۔ اپنی اولاد پھر اپنی ہوتی ہے' لیکن چھوٹی نند کو چین نہ تھا۔

وہ بہرحال جاننا چاہتی تھی۔ اچھا آنے کو تو چھوڑو۔۔۔ گیا کدھر؟ اور چونکہ اس کھوج کی دھن سر میں سما گئی تھی۔ سو معلوم ہو گیا' وہ بچہ شہر کے مشہور و معروف تعلیمی ادارے سے وابستہ ہاسٹل میں تھا۔ چھ برس کا بچہ۔۔۔ ہاسٹل میں تو جا سکتا تھا مگر چھٹیوں میں جب گھر آئے گا تب۔۔۔ لیکن وہ بھائی بھاوج کے گھر نہ آیا۔

اسے پتا چلا کہ بچے کو داخل کروانے والے جوڑے کا نام سنان الیاس ہے اور شجرۃ الدر اور تب ہی بھابھی اتنی مطمئن ہیں۔ یقیناً" بھائی حسین فنانشلی سپورٹ کرتے ہوں گے۔ سنان نے بہن کی خاطر مانا ہو گا' مگر اس کی بیوی کیسے مان گئی' سنا تھا وہ بہت بڑی افسر ہے۔ بہت قابل' محنتی اور ذہین لڑکی۔۔۔

چھوٹی نے سالوں پہلے بھابھی کی چھوٹی بھابھی کو دیکھا تھا۔ وہ پتا نہیں اب کہاں ہوتی تھی۔

باوجود کوشش کہ یہ گتھی نہ سلجھ سکی۔ یہاں تک کہ زین ایک یاد رہ گیا جو سب کی یادداشت کے در کو کبھی کبھار کھٹکا دیتی۔

ہاں پر چھوٹی جب جب سبطین کو دیکھتی اسے زین بری طرح یاد آتا۔ اسے سبطین کے اندر زین کی بے حد شباہت نظر آتی تھی۔

☼ ☼ ☼

چھوٹی کی خواہش سے پرے۔۔۔ شیطان کی منصوبہ بندی سے بہت دور۔۔۔ قدرت کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ جس سے ایک انچ بھی سرکا نہیں جا سکتا۔ قدرت تماش بین نہیں ہوتی' مگر حقیقتیں وقت مقررہ پر خود بخود ظہور پذیر ہونے لگ جاتی ہیں۔

زندگی کے ہر معاملے کی منصوبہ بندی کرنے والی۔ ہر شے کا لائحہ عمل طے کرنے والی شجرۃ الدر زین سنان کے حوالے سے کبھی بھی کچھ طے نہ کر سکی۔ اپنی تمام ذہانت اور حساب کتاب کے باوجود اس کا ذہن سپاٹ ہو جاتا تھا۔

ایک سیدھی بہت واضح کہانی۔ جس میں دور دور تک شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ (ستائش ہی ستائش) آپا نے بچہ گود لیا۔ اپنی اولاد ہو گئی تو سسرال کے پریشر پر واپس کرنا پڑا' لیکن آپا کو بچے سے بہت محبت تھی' سو ادھر ادھر ڈالنے کے بجائے بھائی کے حوالے کر دیا جو صاحب حیثیت تھا۔ وہ بچے کا سرپرست بن گیا۔ ویری گڈ۔

اور شجرۃ کے برخلاف سنان سوچتا تھا' وہ ضرور ہی زندگی کے کسی مقام پر بیٹے کو حقیقت بتا دے گا۔ تب کیا ہو گا۔ کیوں اور کیسے؟ تب کی تب دیکھی جائے گی۔ وہ اللہ سے رحم مانگے اور بیٹے سے معذرت۔۔۔ پھر جو بھی وہ فیصلہ کرے۔

غلطی کی ہے تو سزا بھی ملے گی ہی۔۔۔ جرم کبھی چھپتا نہیں۔

اور اب جب شجرۃ کے پاس کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔

اور سنان کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔

قدرت کے امتحان کا (یا سزا) کا وقت شروع ہو گیا۔ ان دونوں ہی نے سوچا۔ لوگ تو کہتے ہیں سزا کے لیے قیامت کا دن مقرر ہے' جب ہر شے کی جواب دہی کرنی ہو گی تو ان کے لیے ابھی سے قیامت آ گئی کیا؟

زین سنان بارہویں برس میں داخل ہو رہا تھا۔

وہ ذہین تھا۔ شجرۃ الدر کی طرح۔۔۔ کوئی دو رائے نہیں کہ اپنی پڑھائی کے حوالے سے وہ ہر انداز میں شجرۃ تھا۔

لیکن بڑے ہونے کے اس مرحلے میں وہ ہر روز سنان الیاس کے روپ میں ڈھلتا جاتا تھا۔

بس ایک آنکھیں نکال کر کہ وہ شجرۃ الدر ہی کی تھیں۔

مگر۔۔۔ چہرہ' ہونٹ' دانتوں کی قطار' مسکراتے ہوئے لبوں کا پھیلنا اور ایسے میں چہرے کی بدلی حالت۔۔۔ دوران گفتگو وہ آنکھوں سے بھی سمجھاتا جیسے کہ سنان کرتا تھا۔ بات کو مدلل کرنے کے لیے وہ سنان ہی کی طرح بھنووں کو سیکڑتا تھا پھر ہاتھوں کے ذریعے بات کو سمجھاتا۔ وہ چلتا بھی سنان کی طرح تھا پھر سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ نمایاں ہونے والی چیز اس کی آواز تھی۔ ایک قدرتی طور پہ۔۔۔ اور دوسرے وہ باپ کو کاپی بھی کرتا تھا۔

کن لفظوں پر زور دیتا ہے۔ کن کو کھینچتا ہے؟ کہاں بات روک کر دوبارہ شروع کرتی ہے۔

آواز' انداز اور لہجے میں اتنی مماثلت تھی کہ وہ باآسانی سنان الیاس بن کر کسی کو بھی بے وقوف بنا سکتا تھا۔

خود اس نے ہو بہو سنان کے لہجے میں آواز ذرا بھاری کرکے جب شجرۃ کو پکارا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتی تھی۔

"کوئی نہیں پہچان سکتا ناں کہ میں بولا ہوں یا پاپا بولے۔" وہ بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "میں بالکل اپنے پاپا جیسا ہوں ناما۔۔۔؟"

اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شجرۃ کی سانس نکلی۔

جیسے موت کے فرشتے نے دم نکالنے کے لیے پہلا جھٹکا دیا ہو۔

اس کا نام 'مقام' مرتبہ۔ وقت حالات اس چیز کی اجازت دیتے تھے کہ کیا وہ ایک اسکینڈل کی متحمل ہو سکتی تھی۔

اور وہ دنیا کو کیا جواب دے گی۔

اور۔ وہ زین سنان کو کیا بتائے گی کہ۔

اوہ میرے اللہ۔



شجرہ کا بچپن سستے زمانوں کا بچپن تھا۔ بچے سادہ خوراک کھاتے۔ سادہ لباس، کپڑے کی گڑیا اور امیر غریب سب کے بچے کم و بیش ایک ہی طرح پلتے۔ مگر شجرہ تو پھر یتیم تھی۔ اپنے بچوں کے بچپن کو دیکھتے ہوئے وہ سوچتی۔ وہ بس پیدا ہوئی تھی۔ اور بچپن اسی وقت ختم ہو گیا۔ جب ابو فوت ہوئے۔ بعد کی زندگی تو بس ایک دوڑ جیسی تھی۔ جو اسے بس جیتنا تھی۔ بچپن میں اس نے حسرتوں کو خود سے دور کر دیا تھا۔ مگر جب آج وہ صاحب حیثیت تھی۔ سوچتی کہ اپنے بچوں بالخصوص سدرہ کی زندگی میں کوئی خواہش ادھوری نہیں رہنے دے گی۔ اور پھر اب اس کا سوشل سرکل۔ جس طرح کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے بھی وہی ڈگر اپنانی تھی۔ بلکہ بڑھ چڑھ کر اپنانی تھی۔

دو اولادیں تھیں۔ نہیں تین۔ مگر سدرہ سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ اور اس کا برتھ ڈے سلیبریشن۔

اس نے ایونٹ مینجمنٹ والوں کو کال کیا تھا۔ کلر تھیم بے بی پنک تھی فار وومن اینڈ جینٹس ان سوٹ، گھر پر ہی ارینج منٹ کیا گیا تھا۔ بچوں اور بچیوں کے لیے گیمز۔ اندر داخل ہوتے ہی یوں محسوس ہوتا جیسے یہ باربی ورلڈ ہو۔ ہر سو گلابی رنگ بکھرا تھا۔ در و دیوار پر ایسے نقوش ابھارے گئے تھے۔ جن سے احساس ہوتا۔ یہ دور دیس کا پریوں کا شہر ہے۔ میوزک .... غبارے.... جوکر۔

سنان کا کاروباری حلقہ۔ اور شجرہ نے اپنے حلقہ احباب سے ایک جم غفیر اکٹھا کر رکھا تھا۔ ہر شے کو دیکھ کر اس کے اندر ایک طمانیت اور فخر ابھر رہا تھا۔ وہ شاہانہ انداز میں گردن اٹھائے ہر شے کو دیکھ رہی تھی کیک کٹ چکا تھا۔ اور بہت سارے گیمز تھے۔ بچوں اور بڑوں کے لیے۔ اس تقریب میں ہر شخص جیسے چند گھنٹوں کے لیے دنیا کے تمام دکھوں، پریشانیوں کو بھول کر بس انجوائے کر رہا تھا۔ تفکرات سے بہت پرے اور سب سے زیادہ ہلکی پھلکی خود شجرۃ الدر تھی۔

اس نے زین سے وعدہ کیا تھا۔ وہ سدرہ کی برتھ ڈے اس کے بغیر نہیں کرے گی اور اسے لاز" بلوالے گی اسے برتھ ڈے کراچی میں کرنا تھی۔ وہ جس فیلڈ سے وابستہ تھی۔ اس کے عہدے کا تقاضا تھا ایسی گھریلو تقریبات میں۔ افسران بالا اور دیگر عملے اور فائدہ پہنچانے والے لوگوں کو بلوائے۔ اور سب سے تعلقات بنا کر ہی رکھے جائیں۔ سو یہ تقریب جہاں سدرہ کے لیے تھی وہیں سب سے ایک غیر رسمی ملاقات سلام دعا کا بہانہ بھی۔ ہم جیسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں اسی حساب سے جینا ہوتا ہے۔ سو شجرہ اس مقولے پر عمل پیرا تھی۔

سدرہ کی برتھ ڈے میں تاریخ کے حساب سے ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ اور زین اس میں شرکت کی ضد نہ کرے۔ سو وہ وعدہ وعید کرتے وقت ہی یہ سب طے کر چکی تھی۔ زین کو بعد میں کہہ دیتی کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر برتھ ڈے سلیبریٹ کی ہی نہیں جا رہی۔ وہ اگر آجاتا تو اسے خوش کرنے کے لیے فوری طور پر کیک منگوا کر کچھ ہنگامہ کر لیا جاتا۔

بے حد خوب صورت تقریب اپنے جوبن پر تھی۔ گلابی ساڑھی سیاہ کڑھائی سے بوجھل تھی۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس سنان الیاس کی کہنی میں ہاتھ پھنسا کر چلتی۔ وہ فاتح لگتی تھی۔ سنان کی ٹانگ کی وہ ہلکی لنگراہٹ آج بھی اسے نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اس کا فخر تھا۔ اس کی محبت۔ اس کی جیت اس کی خواہش۔ دعا۔

میوزیکل چیئر کا گیم بچوں کے لیے تھا۔ مگر پتا نہیں کیسے اس میں بڑے بھی شامل ہو گئے۔ اور اب۔ گیم کچھ یوں تھا کہ کپلز کھیل رہے تھے۔ سب ان پر بھی زور ڈالنے لگے کہ وہ بھی شامل ہوں۔

سنان نے گیند شجرۃ کے کورٹ میں ڈال دی۔ "اگر یہ کھیلیں گی تو بندہ بھی حاضر ہے۔ دراصل بندہ حکم کا بندہ ہے۔ آپ تو سب سمجھتے ہیں ناں سومرو صاحب۔"

سومرو صاحب نے اپنی بیگم کی جانب مصنوعی بے چارگی سے دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

"میں نے ساڑھی نہ باندھی ہوتی تو۔" شجرۃ نے نزاکت سے پلو والا بازو اٹھایا۔

"یعنی آپ پہلے سے پیش بندی کر کے آئی ہیں۔"

"اب آپ جو کہیں۔" شجرۃ مسکرائی، تالیوں کا شور قہقہے۔ بک اپ کرنے کے لیے نعرے اس پر میوزک۔ جب میوزک رکتا۔ تب ہنسی کا نیا طوفان۔ مزے کی بات یہ تھی چھ ٹیموں میں سے چھ کی چھ مسز جیتی تھیں۔

مسز پٹیل بہت دبلی پتلی تھیں اور مسٹر پٹیل بہت موٹے۔ مگر میوزک رکنے پر کرسی پر مسٹر پٹیل تھے۔ پل بھر کی حیرت کے بعد شدید قہقہے شروع ہو جانے تھے۔ مگر میوزک رکتے ہی سناٹے میں گونجتی آواز نے سب کو چونکایا۔

"ماما!" شجرہ اور سنان دونوں کے ہاتھ پہلو میں گر گئے اور شاید کمرے کی چھت بھی۔ ان کے سر کے اوپر۔ سب کی گردنیں مڑی تھیں۔ دروازے کے بیچ و بیچ زین سنان کھڑا تھا۔ اور اس کی حالت۔ جہاں اندر سب گلابی اور سیاہ سوٹ میں ملبوس بچے بڑے سب۔ وہاں زین کا لباس اور حلیہ۔

بلو جینز پر سفید آدھی آستین والی شرٹ۔ کمر کی پشت سے بیگ چپکا تھا۔ پیروں میں جاگرز اور اس کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ کیا مٹی میں لوٹنیاں لگا کر آیا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ وہ شاید رو تا رہا تھا (رو بھی رہا تھا) اور یقیناً "بھاگتا آیا تھا کہ اب تک ہانپ رہا تھا۔ سانس ابھی تک متوازی نہ ہوئی تھی۔ اور اس پر شدید ترین صدماتی کیفیت.... اس نے چاروں طرف دیکھا چھت تک کو پھر اس کی نگاہ باربی کا روپ دھارے کھڑی سدرہ پر پڑی۔

پھر اس نے ماں باپ کو دیکھا۔ تو اس کے چہرے کا رنگ یوں ہو گیا۔ جیسے کہ دل بس پھٹ جانے کو ہے۔ ایک۔ دو تین۔

"آپ نے میرے بغیر سدرہ کی برتھ ڈے کر لی۔ میں شامل نہ ہو سکوں "ایک ہفتہ پہلے ہی کر لی۔ وہ تو میں نے سرپرائز دینے کے لیے گفٹ خریدنے کے لیے گھر فون کیا تو خیرن بولی۔ برتھ ڈے تو کل ہو رہی ہے کراچی میں۔

آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا ناں ماما؟ اور بابا! آپ نے بھی؟"

"تت۔ تمہیں یہ کیا ہوا ہے؟" سنان نے پوچھا تھا۔ مگر شجرۃ ٹرانس سے ابھر کر اب اس کی جانب جیسے بھاگی تھی۔ اس کے بالوں میں بھی تنکے اور مٹی تھی۔ اور پیشانی پر رگڑ کا نشان تھا۔ اور کہنی پر گہرا زخم۔ تھوڑی کے پاس بھی ایک لمبی سرخ لکیر تھی۔

"کس نے مارا ہے تمہیں؟"

"کسی نے بھی نہیں مارا۔ میں بھاگ بھاگ کر آ رہا تھا۔ مجھے لگا۔ برتھ ڈے ختم ہو جائے گی۔ وہاں روڈ کے اینڈ میں کھدائی ہو رہی تھی۔ میں اندر گر گیا۔ کسی نے نکالا بھی نہیں۔ پہلے میں نے سوچا۔ صبح جب مزدور آئیں گے تو مجھے نکال لیں گے۔ پھر مجھے خیال آیا۔ برتھ ڈے ختم ہو جائے گی۔ تو میرا گفٹ۔ پھر میں بڑی مشکل سے نکلا۔ پھر دوبارہ بھاگا۔"

وہ سانس لیے بغیر بولنا چاہتا تھا۔ آنسو تو تواتر سے بہہ ہی رہے تھے۔

"اور پھر بھی۔" اس نے پیچھے لٹکتے بیگ کو آگے کیا۔ اس میں سے ایک ڈبا برآمد کیا۔ جس میں کانچ بج رہے تھے۔ اس نے بعجلت ڈبا کھولا۔ اس کا بدترین خدشہ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔ ڈھکن ہٹتے ہی بہت سے نازک کانچ زمین پر گرنے لگے۔ تو ساتھ ہی وہ بھی گھٹنوں کے بل گر سا گیا۔ وہ کانچ کو ٹٹول رہا تھا۔ کسی بھی احتیاط کے بغیر۔

"پھر بھی میرا گفٹ ٹوٹ گیا۔" یہ کرسٹل سے بنی باربی ڈول تھی۔ وہ اس کے چہرے کو اٹھا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اب میں سدرہ کو کیا دوں گا۔ اتنے پیسے جمع کر کے میں نے میم سے یہ ڈول منگوائی۔ میری ڈول۔" وہ کسی قدر جنون سے اسے جیسے جوڑنا چاہتا تھا۔

"سی۔ ہائے!" کانچ پوروں میں گھس گیا تھا شاید۔ اور سامنے کھڑی ساکت وجامد شجرۃ میں جیسے روح واپس آئی۔

"چھوڑ دو زین۔!" اس نے تیزی سے کہا تھا اور اسی کی طرح گھٹنوں کے بل گری تھی۔ سنان بھی آگے بڑھا تھا۔ وہ ایک گھٹنا موڑ کر اور دوسرے کے وزن پر ان کے قریب آبیٹھا تھا۔

"ایسے کانچ کو ہاتھ نہیں لگاتے زین! تمہیں چوٹ لگے گی۔ خون نکلے گا۔"

"لگاتے ہیں۔۔۔ کانچ کو ہاتھ لگاتے ہیں۔" وہ ضدی اور جنونی ہو گیا۔

"میں نے اپنی پاکٹ منی جمع کی تھی۔ اب میں سدرہ کو کیا دوں؟ اور اب تو برتھ ڈے بھی ختم ہو گئی۔۔۔ میں۔" وہ تیزی سے ڈبا پلٹ کر باقی ٹکڑے نکالنے لگا۔ گڑیا کی ٹانگیں سلامت تھیں۔ چہرہ بھی لیکن درمیانی حصہ فقط کرچیوں کی صورت تھا۔

"میں جوڑوں گا۔ میں اسے جوڑ دوں گا۔ ابھی ابھی جوڑوں گا۔"

یقیناً "اسے گڑیا کے ٹوٹنے کا صدمہ اتنا نہیں تھا۔ صدمے کی اصل وجہ تو اس کے بغیر برتھ ڈے تھی۔ اسے گڑیاں جوڑنی نہیں آتی تھیں۔ لیکن گڑیاں جمع کرنا تو آ رہا تھا ناں۔ وہ خود ہی پہنچ جاتا ایک روز حقیقت تک۔ مگر۔

صدمے نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے جیسے۔ اسے بس گڑیا جوڑنی تھی۔ ہر صورت۔۔۔ اس نے کانچ کے باریک باریک ٹکڑوں پر یوں ہاتھ پھیرا۔ جیسے ملائم گوندھی مٹی سے فرش کو لیپ رہا ہو۔ اور نتیجہ۔

وہ ہاتھ مار مار کے ٹکڑے سمیٹ رہا تھا۔ لاؤنج کے سفید فرش پر خون کی لکیریں بنتی جاتی تھیں۔ جیسے خون کا پوچا لگایا جا رہا ہو۔

اور ماں باپ کو اس کا جنون ہولائے دے رہا تھا۔ وہ روکنے کی سعی کرنا چاہتے تھے اور سعی تو لوگوں کے سوال کے جواب کے لیے بھی کرنی تھی۔ جو ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے یہ لڑکا؟ ماں کہاں گئی ہے؟ رو کیوں رہا ہے؟ اور شجرۃ کی یہ حالت۔ اور سنان الیاس کی بے بس کیفیت۔"

"ارے ہاں۔ سنا تو تھا۔ ایک بچہ ایڈاپٹ کر رکھا تھا۔"

"نہیں۔ گارجین بنے ہوئے ہیں دونوں۔"

"نہیں۔ اصل کہانی یہ ہے کہ یہ سنان کی مسز۔۔۔ کسی کو یہاں تک کے معاملے کی خبر تھی۔

اور شجرۃ کے کانوں تک یہ قیاس آرائیاں۔ اچھے بے یقین سوال پہنچ رہے تھے مگر وہ جیسے کچھ سن ہی نہ رہی تھی۔

وہ تو بس اسے باز رکھنا چاہ رہی تھی۔ جو اپنے ہی خون سے ہولی کھیل لینا چاہتا تھا۔

"اپنی جان لو گے کیا؟" وہ بدقت بولی۔ اسے غش آ رہے تھے اور کلیجہ جیسے کسی شکنجے میں جا پہنچا تھا۔

اچھا تو لے پالک ہے یہ۔ "مسولی بے ہنگم منہ چنائے نے سارا معاملہ گویا سلجھا کر خود بھی سکھ کا سانس لیا۔ اور اطلاع بہم پہنچائی۔ سب نے سن لیا اور کیا زین نے بھی؟ شجرۃ کے سر پہ گرز لگا تھا۔ اس نے ایک نظر سب لوگوں کو دیکھا۔ شدید ترین اذیت اور شرم ساری سے پُر سنان الیاس کا چہرہ۔ ہر شے سے بے نیاز روتا زین سنان الیاس (اگر وہ سن لیتا) ایک غلطی کے بعد دوسری سنگین غلطی)۔

اس نے یک دم زین کو خود میں بھینچ لیا۔ اپنے ساتھ لیے کھڑی ہو گئی۔ اس کے خون سے تر ہاتھوں نے گلابی ساری کو داغ دار کر دیا اور وہ ہر شے سے بے نیاز حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"لے پالک نہیں ہے یہ۔ میرا اپنا بیٹا ہے۔ یہ میرا اپنا بیٹا ہے وہ بیٹا جسے میں نے نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھا۔ کان کھول کر سب سن لیں۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ شجرۃ الدر اور سنان الیاس کا اپنا بیٹا۔ جھوٹ بول رہے ہیں ہم بارہ سالوں سے کہ۔"

وہ اتنی زور سے بولی تھی کہ گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حواس جیسے ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ زین کو سہارا دے رہی تھی۔ اگلے پل اسی کے کندھے پر ڈھے گئی۔ اور وہ اپنا غم بھول کر اسے رونے لگا۔

"مام۔ مام۔ بابا! دیکھیں بابا! مام کو کیا ہو رہا ہے آئی ایم سوری مام۔ میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔ مام پلیز۔"

اور تقریب ہی میں موجود ایک ڈاکٹر صاحب آگے بڑھے تھے۔ ان کے لیے دو مریض تھے۔ ایک ہوش و خرد سے بے گانہ تھا۔ اور دوسرے کے ہاتھ بری طرح زخمی تھے۔

شجرۃ کے خاندان نے سالوں ہوئے تمام ناتے توڑ ڈالے تھے۔ مگر سنان کے تمام بہن بھائی موجود تھے۔ وہ ایسی بکواس افواہوں کو سن کر لاحول پڑھ لیتے تھے۔ اکثر ایسی آواز آجاتی تھی۔ کہ یہ بچہ دراصل شجرۃ اور سنان کا ہے۔ مگر اسے تو آپا نے گود لیا تھا۔

لیکن آج شجرۃ کا چیخنا مزید سوال کی گنجائش رہی ہی نہیں۔ دنیا کو بھی الف مل جانا چاہیے۔ بے تک وہ خود ہی پہنچ جاتی ہے۔ خواہ جیسے بھی پہنچے صحیح یا غلط۔

سو یہاں جتنے منہ تھے اس سے دوگنی چوگنی باتیں تھیں۔ جو جس کے منہ میں آ رہا تھا' کہے جا رہا تھا۔

شجرۃ الدر کے اپنے منہ سے برملا اظہار کے باوجود یہ مبہم قصہ تھا۔ اور ابہام دور کرنے کے لیے چھوٹی موجود تھی۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھی خاتون کے کان میں گھس کر وہ معلومات سجا بنا کر پیش کر دیں۔ جو اسے ایک اتفاقی ملاقات میں ہما بھابھی سے پتا لگی تھیں۔ (آفاق بھائی انہیں طلاق دے چکے تھے)

چھوٹی سے شجرۃ الدر کے ایسے تعلقات نہیں تھے کہ وہ اسے سالگرہ میں بلاتی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ جب وہ دونوں آپا کو کارڈ دینے گئے۔ تب چھوٹی بھائی کے گھر موجود تھی۔ اس نے سنان سے شکوہ کیا۔

"آپی آپا ہی کو بلا رہے ہو۔ کیا میں تمہاری بہن نہیں؟" یہ دونوں بری طرح شرمندہ ہوئے۔

اگلے روز سنان خود جا کر کارڈ دے کر آیا۔ چھوٹی کا دلی ارمان تو بس زین کو دیکھنا تھا۔ مگر یہاں زین کو بھی دیکھ لیا۔ اور باقی سب کچھ بھی دیکھ لیا۔

اونچی مسند پر بیٹھی شجرۃ الدر کی گھٹنوں کے بل جھکی دگرگوں حالت نے حسد کی عجیب سی آگ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ بڑا مزہ آیا۔



"آج کے دن کی بات نہ کرو۔ یہ کہانی جب بھی کھلنی تھی۔ ایسا ہی تماشا ہونا تھا۔ اور کہانی کھل جانے کے ڈر نے مجھے کبھی کھل کر سانس بھی نہ لینے دیا۔ لیکن ابھی میں اتنی ہلکی پھلکی ہوں کہ بس۔" وہ کرسی پر بیٹھی تھی کہنی ٹیبل پر کھڑی تھی اور وہی ہاتھ سر پر دھرا ہوا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ مسلسل بول رہی تھی۔

یہ سنان کی لائبریری تھی۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف ٹیبل کے عین اوپر لٹکتے لیمپ کی روشنی ان دونوں پر پڑ رہی تھی۔

"پتا ہے میں نے پہلے ہی اسے کن دقتوں سے یہ جتایا اور باقی سب بھلایا۔ کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں ماما نہیں مام ہوں۔ مگر میں کالج میں پڑھتی تھی ناں۔ تو اس لیے اسے پھوپھو کے پاس رہنا پڑا تو وہ پھوپھو کو امی کہنے لگا۔ مگر مام بس میں ہوں۔

اور وہ مجھے ہمیشہ ایک بوجھ لگا۔ جو میرے اعصاب پر سوار تھا۔ پھر بوجھ نے شکل بدل لی اور وہ میرے دل کا بوجھ بن گیا۔ اگر آج سچ نہ کہتی تو اسے بے موت مار دیتی۔ وہ تو پہلے ہی میرے حوالے سے۔۔۔ ہمارے حوالے سے شکوک کا شکار تھا۔

پھوپھی ماں نہیں ہے۔۔۔ ماں ماں ہے۔ پھر لے پالک کہہ کر میں ماں بھی بدل دیتی۔ تو کیا وہ پوچھنے نہ آتا کہ پھر ماں کون ہے۔ اسی کا پتا بتا دو۔

جو تماشا کل لگے گا۔ شاید ٹی وی پر خصوصی بلیٹن چلے' یا اخبار کی مین اسٹوری بن جائے۔ پورے ملک سے چھانٹ کر بنائے جانے والے افسر۔ جو ہر پہلو سے نمونِ بے عیب ہوں' تب ہی چنے جاتے ہیں۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں وہ ایسے کام کرتے ہیں۔ اس پر پھر دنیا کی ہرزہ سرائی۔"

"کوئی بات نہیں نکاح ہوچکا ہے۔" اس جملے نے کتنی بے فکری دے دی۔ نکاح اللہ کے لیے تھا اور رخصتی دنیا کے لیے۔

"میری ذہانت نے بڑے بڑوں کو پچھاڑ دیا۔ اور تم یہ ڈھیر کتابیں لئے بیٹھے ہو نکاح ہماری سیف سائیڈ بن گیا۔ جب کہ وہ سب جو ہوا' سراسر لاپروائی تھی۔ معاشرے کے اصول و قوانین۔ اقدار۔ روایات۔

دین کو سنوارنا ہو تو دنیا بہتر رکھنی پڑتی ہے اور دنیا کو سنوار کر رکھا جائے تو آخرت بہتر ہوجاتی ہے۔

ہم دین کے احکام اور دنیا کے چلن کو ساتھ لے کر چلنے والے کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ ایک کو رکھ کے' ایک کو چھوڑ دیا جائے تو انجام کار وہی ہوتا ہے۔ جو آج ہوا۔ جو تماشا ہوا۔ اور جو مزید ہونے والا ہے۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"جب ہم سب طے کرچکے تھے۔ کہ میں اپنا بزنس باہر سیٹ کرلوں گا۔ اور تم کہیں باہر پوسٹنگ کرواؤ گی۔ پھر ہم تینوں بچوں کو ساتھ رکھیں گے۔ تو آج خود پر قابو رکھتیں ناں۔" سنان نے ٹیبل پر دھرے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شجرۃ نے جملہ تحمل سے سنا۔ وہ اپنے اور اس کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ (ہاتھ پکڑنے سے تو ابتدا ہوئی تھی۔ پہلا قدم۔)

"نہیں رکھ سکی قابو۔" اس نے بہت جارحانہ انداز سے اپنا ہاتھ کھینچا اور دل پر رکھ لیا۔ "وہ کبھی نہیں رویا۔ خود کو کمپوز کرکے مردانہ وار کھڑا ہونا اس کی فطرت ہے' یہ عادت اس نے مجھ سے لی سنان! میں بھی تب روتی تھی جب ہر جانب سے راہیں مسدود ہوجاتیں۔ رونے کے بجائے کسی بھی شے کا حل ڈھونڈ کر ابھرنا میں نے بہت بچپن میں سیکھ لیا تھا۔

اس کی آنکھوں کا شکوہ۔ اس کے جملے۔ اس کا حلیہ۔ وہ ہمارا بیٹا ہو کر۔ ہم سے اتنا الگ کیوں لگ رہا تھا؟

تم صحیح کہتے ہو' مجھے خود پر قابو پانا چاہیے تھا۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرا دماغ کمپیوٹر بن گیا۔ جمع تفریق' جوڑ توڑ۔ اسے یہ کہہ کر بہلاؤں گی۔ اور دنیا کو وہ کہہ کر ٹھلا دوں گی۔ لیکن۔" وہ رونے لگی "لیکن جب میں۔" اس نے جیسے شدید تکلیف میں گھر کر آنکھیں میچی تھیں۔ "اس کا خون دیکھا' لال سرخ گاڑھا۔ بری طرح بہتا ہوا خون۔ بس سنان! میں بھول گئی کہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ دنیا کے پاس سنگسار کرنے کا اجازت نامہ بھی ہے۔ میں بھول گئی تھی۔ میں ایک دنیا کے سامنے کھڑی ہوں اپنا نام بھول گئی۔ اپنا مقام' عہدہ۔ قدرومنزلت۔ سدرہ کو بھول گئی شمیر کو بھی۔ تم بھی یاد نہ رہے' کچھ یاد نہیں رہا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نظر آتا تھا تو بس خون' وہ خون جو میرا اپنا تھا۔ وہ تکلیف کے احساس سے باورا ہو کر۔ کرچیوں سے کھیل رہا تھا۔ اور موت میری ہورہی تھی' تکلیف ایسی تھی جیسے ملک الموت نے سانس شہ رگ پر لاکر روک دیا ہو۔ نہ میں زندوں میں۔ نہ مردوں میں اور۔ یہ سب میری وجہ سے۔" وہ ماتمی انداز میں اپنا ہاتھ سر پر مارنے لگی۔

"ہماری وجہ سے شجرۃ؟" سنان کا لہجہ چور چور تھا۔

شجرۃ نے ہاتھ ہوا میں چلایا۔ جیسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وجہ کے لیے میں کا صیغہ استعمال کیا جائے گا یا ہم کا۔

"آپا نے ہمیں بلایا تھا۔" وہ اپنے آنسو پونچھ کر۔ گلا صاف کرکے دوبارہ بولنا شروع ہوئی۔ "وہ کہہ رہی تھیں۔ وہ اسے اب مزید نہیں رکھ سکتیں۔ میں تم سے لڑتی الجھتی گئی تھی سنان! بلکہ جانا چاہتی بھی نہیں تھی۔ میں بیوروکریسی کی ایک افسر بن چکی تھی اور افسر بننے کے بعد آپ کو پتا لگتا ہے۔ اب مزید آپ اور کیا کیا بن سکتے ہیں۔ ایسے میں بچہ۔ ایک نیا جھنجھٹ

اور میں آپا کو سنانا چاہتی تھی کہ یہ مانگے کی چیز نہیں ہے کہ اب ضرورت پوری ہوگئی تو واپس لے لو۔ یہ جیتا جاگتا انسان ہے اور۔ بہت لمبی تقریر تیار کرکے لے کر گئی تھی۔ میرے دل میں کیا چل رہا تھا۔ میں نے نہیں نہیں بتایا۔ اور پھر مجھے دنیا کی جواب دہی کا بھی خیال تھا۔ اور آپا کے پاس پورا پلان تھا۔ ہم بچہ کیسے رکھ سکتے ہیں۔ مجھے وہ سن کر بھی غصہ آرہا تھا۔ میں غصے سے کھولتی۔ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ باہر لان میں ٹہلنے لگی۔

اور باہر لان میں ایک کونے میں وہ اپنی کتابیں کھولے بیٹھا تھا۔ میں اسے کتنی ہی دیر تک دیکھتی رہی۔ کبھی لگتا' وہ تم ہو اور کبھی لگتا۔ میں آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ وہ پڑھ رہا تھا۔ مجھے لگا' وہ رو بھی رہا تھا۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتا تھا اور پھر سے سوال کرتا تھا۔ نجانے کس جذبے کے تحت میں اس تک چلی گئی۔ وہ واقعی رو رہا تھا۔ حساب کی کاپی پر جگہ جگہ ٹپ ٹپ آنسو گرے تھے۔

"کیوں رو رہے ہو؟"

"مجھے تھرڈی فگرز والے پلس کے سوال نہیں آتے اور کل ٹیسٹ ہے۔"

"ٹیچر نے نہیں بتائے۔ ٹیوشن نہیں پڑھتے تم۔؟"

"بتایا تھا۔ ٹیوشن بھی پڑھتا ہوں۔ مگر یہ سوال۔ مجھے فیل ہونا اچھا نہیں لگتا۔"

"تو پھر کیسے حل کررہے ہو۔ ایک ہی سوالوں کو بار باریوں لکھ رہے ہو؟"

وہ اس سوال پر ذرا سا ہچکچایا۔ کچھ سوال جواب کے ساتھ متعدد بار لکھے تھے۔

"میں انہیں اتنی بار لکھ لوں گا۔ کہ جب امتحان میں آئیں گے تو مجھے معلوم ہوگا کہ اس کا آنسر (جواب) یہ ہے۔"

"کیا؟" میں حق دق رہ گئی۔ "اور اگر فگرز چینج کرکے سوال آگئے تو۔؟"

"تو کیا۔" اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا بن گیا۔ اسی خدشے سے تو رونا آرہا تھا۔ "فیل ہو کر

آجاؤں گا۔"

اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ تو وہی طریقہ تھا۔ جو میں کرتی تھی۔ حل شدہ سوالوں کو اتنی بار لکھتی تھی۔ کہ مجھے ان کا لکھنا یاد رہ جاتا تھا۔ میں انگلش کے ٹینس سمجھتی نہیں تھی۔ رٹے لگا کر ازبر کرتی تھی اسی وقت مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میرے ابو فوت ہو چکے تھے۔ اور کوئی مجھے پڑھاتا نہیں تھا۔ سمجھاتا نہیں تھا۔ اور میں بھی اسی طرح کسی خفیہ کونے میں بیٹھ کر ایسے ہی لکھتی تھی۔ اور خدشوں میں گھر کے بے آواز روتی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ میرے ابو اللہ کی طرف سے نہیں تھے اور اس کے ماں اور باپ دونوں تھے اور وہ ہو بہو مجھ پر گیا تھا۔ وہ میرا بیٹا تھا سنان! اور وہ ایک لمحہ تھا جب میرے دل کی زمین شق ہوئی۔ وہ اندر سما گیا۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور کہا۔ میں اسے سوال سمجھا دوں گی۔ اور گود میں بھرنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی نعمت تھا۔۔۔ خوشی تھا۔۔۔ خوشبو تھا۔

میرا لخت جگر۔

لیکن اسے برملا اپنانے کی راہ میں اتنے سال گزر گئے۔" وہ ہانپ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

"میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی دھوکا نہیں دیا۔ میں کچھ معاملات میں خود غرض ضرور تھی۔ مگر کمیٹڈ بھی تھی۔ جو ایک بار کرلیا۔ کہہ دیا۔ وہی کروں گی۔"

"تمہیں آج تک ایک بات کی خبر نہیں۔"

وہ روتے چہرے کے ساتھ بہت دل سے مسکرائی۔

سنان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اتنی کامیابیوں کو بٹورتے ہوئے راستے میں بہت لوگ ملے۔۔۔ کہتے تھے مجھے تو کچھ بھی مل سکتا ہے۔ قابل' ذہین' اتنی ی ی ی بڑی افسر۔ اور بہت خوبصورت ینگ۔ پھر ایک درمیانے درجے کے بزنس مین کے ساتھ۔ جوڑ کچھ بنتا نہیں۔"

وہ بات روک کر پھر سے مسکرائی۔ سنان کے چہرے کو دیکھا جس پر سایہ سا لہرا رہا تھا۔

"پتا ہے میں نے کیا کہا۔ ان لوگوں سے۔ اور خود سے بھی۔ تم میرے دوست تھے۔ رہبر و رہنما۔ جس کا ہاتھ پکڑ کر میں نے دنیا دیکھی۔ میری طلب۔ میری خواہش۔۔۔ میری محبت۔ اور۔"

(سنان کا چہرہ اپنے رنگ میں واپس لوٹ گیا۔ شجرہ نے کبھی ایسے الفاظ میں اظہار نہیں کیا تھا۔ سنان علی نے زندگی بھر اسے شعر سنا سنا کر بتلایا تھا)

"اور میری ایمان داری۔" شجرہ نے جملہ مکمل کیا۔

"میں نے زندگی میں جو کام بھی کیا۔ پورے دل سے ایمان داری کے ساتھ۔ جو عہد کیا اسے پورا کیا۔ کسی چیز کو راستے میں نہیں چھوڑا۔ پھر میری سیدھی زندگی میں مجھ سے اتنا بڑا بلنڈر کیسے ہوگیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی اور میں نے زندگی میں ایک نئی بات یہ بھی سیکھی کہ۔

سچ بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ آپ کو مزید بہت ساری مشکلوں سے بچالیتا ہے۔ خطاوار کو سزاوار بھی ہونا چاہیے۔

غلطی ہم نے کی ہے تو ہم ہی بھگتیں ناں' زین کا کیا قصور ہے کہ وہ الجھے سوالوں میں عمر کا یہ خوب صورت دور برباد کردے۔ میں اسے ہاسٹل سے نکال لوں گی۔ میں اسے گھر لے آؤں گی۔ میرے تین بچے ہیں' مائیں اولاد میں بھید بھاؤ نہیں کرتیں۔ مگر سنان! مجھے اپنی تینوں اولادوں میں زین سب سے پیارا ہے۔"

اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہوگیا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔"

"وہ ہماری غلطی ضرور ہے مگر اس میں خود اس کی کوئی غلطی نہیں اور اس کے ساتھ مزید کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا کو جواب دہی ہم کریں گے۔"

"میں نے اسے کبھی غلطی نہیں سمجھا' وہ محبت تھا۔ جو آج بھی ہم دونوں کے بیچ زندہ ہے۔"

"محبت۔!" شجرہ نے زیر لب کہا۔

(ہاں وہ ضرور محبت تھا۔ لیکن انسان ہر بار محبت کے نام پر دھوکا ہی کیوں کھاتا ہے۔ غلطی ہی کیوں کرتا ہے۔ محبت بھگتنی ہی کیوں پڑتی ہے)

"اب تم شعر نہیں سناتے سنان! بہت سال پہلے

ایک نظم سنائی تھی۔ مجھے شعر سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ مگر وہ نظم دل میں اتر گئی۔ میں ان دنوں اس نظم کے زیر اثر زندگی کو جینے لگی تھی۔ ہر ہر لفظ میرے دل میں اتر رہا تھا۔ روح میں گھل رہا تھا۔ آج وہی نظم دوبارہ سناؤ۔" اتنی گمبھیر صورت حال میں انوکھی فرمائش۔

سنان چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ متوقع نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کون سی نظم؟"

"وہی۔ وہ والی۔ محبت خواب کی صورت۔"

سنان کو شعر اور نظمیں غزلیں کبھی نہیں بھولی تھیں۔ اس نے انہیں سنانا چھوڑ دیا تھا۔ پڑھنا نہیں۔

"سناؤ سنان! اس میں محبت کی ہر شکل کو بتایا گیا ہے۔ ہر روپ کو۔ مگر ایک وہ روپ بھی ہے۔ جو میں نے اتنے سالوں بعد سمجھا۔ ایک نئی تشریح۔ ایک نئے معنی۔"

اس کے چہرے پہ اذیت رقم ہوگئی۔ ساتھ ہی بے چینی کہ وہ نظم سنانا شروع کرے۔

سنان کے لب کھلے۔ اس نے بے حد خوب صورت لہجے میں ٹھہراؤ کے ساتھ لفظوں کی نغمگی کو برقرار رکھتے ہوئے سنانا شروع کیا تھا۔

محبت خواب کی صورت۔

رات کے سناٹے میں اس کی آواز نے عجب ماحول پیدا کردیا تھا۔ نظم مکمل ہوئی تو وہ شجرہ الدر کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ اب کیا کہے گی۔ وہ رو چکی تھی۔ حال دل سنا چکی تھی۔ اک نئی صبح رات کی گرفت سے دامن چھڑانے ہی والی تھی۔ ایک نئی صبح' امتحان' لعن طعن آزمائش' تضحیک' سوال' اشارے کرتے مضحکہ اڑاتے لوگ۔ جواب دہی کی نئی صبح۔

سنان کو اندازہ تھا آنے والی صبح اور آگے کی مزید زندگی کیسی ہوسکتی ہے؟

"اس نظم میں ایک اضافے کی شدید ضرورت ہے۔ شاعر نے محبت کی ہر صورت بتادی مگر مجھے تو اب بس یہی لگا۔ محبت کے نئے معنی۔" شجرہ نے بولنا شروع کیا اس کے چہرے کے تاثرات عجیب تھے اور آنکھوں میں خود اذیتی۔

" محبت داغ کی صورت۔

میری جمع تفریق کا تو یہی جواب آیا۔ محبت داغ کی صورت۔"

سنان ششدر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اسے لگا وہ شاید سالوں تک ایک حرف بھی نہ کہہ سکے۔ دونوں نے خاموشی اوڑھ لی۔ چھت کے عین اوپر جھولتے لیمپ کی روشنی اتنی زرد پہلے تو کبھی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

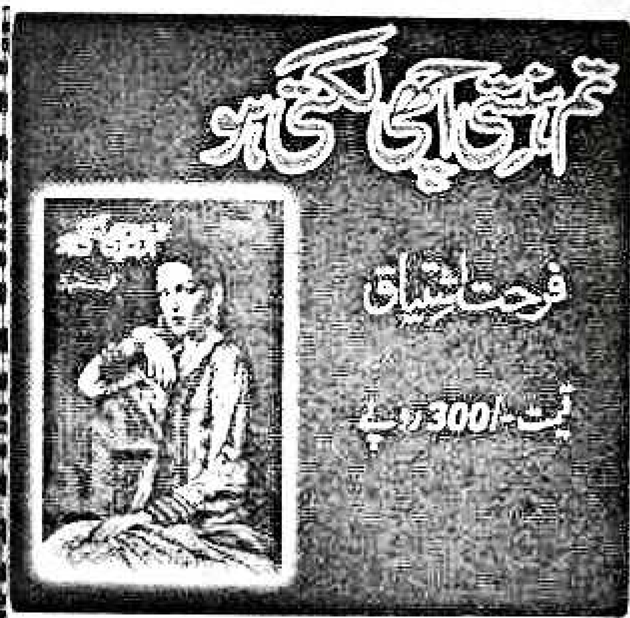
اور جشن کی اس رات کا خاتمہ بس ہونے کو تھا۔ ابلیس مردود اپنے چیلوں کے برہنہ رقص کو دیکھ رہا تھا۔ آگ' شراب' نجاست' غلاظت سے سجا ابلیس کا دربار۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ لوٹنیاں لگا رہا تھا۔

"دنیا میں ہر روز ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں اور پھر اپنی شناخت کا سوال لے کر در در کی خاک چھانتے ہیں دنیا انہیں خوب ذلیل و رسوا کرتی ہے۔ پر تو تب تو اتنا خوش نہیں ہوتا۔" ایک منہ چڑھا چیلا سب کا ترجمان بن کر پوچھ ہی بیٹھا۔

"ہو تو تم سب میرے شاگرد مگر تمہارے سیکھنے کو بہت کچھ باقی ہے ابھی۔ بچے ہو تم سب ابھی بچے۔"

وہ مکروہ آواز میں قہقہہ لگا رہا تھا۔

"یہی تو اصل بات ہے میرے نادان' کم عقل' پیرو



کار! ایک جائز کو ناجائز۔ صحیح کو غلط بتا کر جو مزہ اس بار لوٹا وہ تو شاید صدیوں تک یادگار ہو گا۔ اور تم سب کے لیے قابل تقلید بھی۔ غلط کو تو دنیا غلط کہتی ہے۔ مزہ تو یہ آیا کہ ہم نے صحیح کو غلط بتایا' دکھلایا اور جتایا۔ کسی کو یاد نہیں کہ نکاح ہو چکا تھا۔ وہ میاں بیوی تھے۔ یاد ہے تو بس یہ کہ شادی سے پہلے ہی رنگ رلیاں۔ ہاہاہا۔ واہ بھئی واہ۔"

وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

"اور اگر کوئی دل بڑا کر کے نکاح یاد بھی کروا دیتا ہے تو تب بھی وہ تھو تھو ہوتی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔"

لوگوں نے طلاقیں دیں۔ حرام کاری کی ہر شکل اختیار کی۔ ایک سے بڑھ کے ایک گناہ۔ کہ میرے لیے۔ میرے لیے تفریق کرنا مشکل ہو گئی کہ کس گناہ اور غلطی کو نمبر ون کہوں۔ مگر جو لطف میں نے اس بار اٹھایا۔" وہ سرور میں آ کر جھومنے لگا۔

"لیکن اس اوپر والے کے سامنے تو سب ٹھیک ہے؟" نسبتاً "نئے" چیلے نے ذرا دھیمے سے کہا تھا۔

"بے وقوف!" وہ بری طرح ناراض ہوا۔ "اوپر والے کے پاس جب جائیں گے تب جائیں گے۔ ابھی فی الوقت تو دنیا کو جواب دہ ہوں گے۔"

"تو کیا ہمارا کام ختم۔ اب اس ٹارگٹ پر کام نہیں کرنا کیا؟"

"بظاہر ختم ہو گیا۔ لیکن ابھی دیکھیں گے' دنیا اس جائز کام پر کتنے پتھر مارتی ہے۔ پھر ان کے منہ سے سوال کروائیں گے۔ انہیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح اسے دنیا کی زبان سے شجرو الدر اور سنان الیاس کے لیے گھناؤنے سے گھناؤنے جملے نکلوانے تھے۔ ذلیل کرنے کے نئے نئے خیال دلوں میں ڈالنے تھے۔

آخر کو وہ دنیا میں اسی کام کے لیے تو بھیجا گیا تھا۔ اللہ کے دربار سے دھتکارا گیا تھا۔

"لیکن' اگر تو ناراض نہ ہو تو ایک بات پوچھ لوں؟" نئے چیلے کی الجھن ہنوز تھی۔

"پوچھ پوچھ۔ تو ابھی بچہ ہے۔ سیکھے گا۔ وقت لگے گا مگر تو سیکھ ہی لے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے بڑھاوا دیا۔

"اللہ۔ میرا مطلب' اللہ کے نزدیک تو وہ مجرم نہیں ہیں ناں تو۔"

"لیکن دنیا کے نزدیک تو ہیں ناں!" شیطان نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا۔

"یاد رکھ' دنیا کے کسی بھی مذہب کو مانتے ہو' مذہب کے احکامات کو پوری طرح ماننا ضروری ہے۔ نکاح میں گواہ اس کا اعلان اور تعلق کے بعد ولیمہ اس تعلق کا اعلان ہے۔ غلطی تھی۔ گناہ نہیں تھا لیکن اس تعلق کے بعد اسے چھپایا گیا۔ دین کے ساتھ دنیا بھی ضروری ہے دنیا کے طور طریقے بھی اپنانے پڑتے ہیں۔ اگر وہ پوری طرح دین پر عمل کرتے۔ رخصتی کراتے۔ ایک غلطی کو گناہ نہ بناتے لیکن انہوں نے اپنی غلطی کو گناہ بنا دیا۔ اسے چھپانے کی کوشش کی۔"

"یہ تو اللہ کے احکام ہیں۔ مذہب پر چلنا۔ تو کیا تو اللہ کے حکم کو مانتا ہے۔ تو تو منکر اول ہے ناں؟ پھر تیرے منہ سے ایسی باتیں؟"

سب چیلوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ شیطان نے ایسی سیکھ تو پہلے کبھی نہیں دی تھی۔

"بے وقوفو! مردودو۔ میں اس کا حکم نہیں مانتا۔ میں نے انکار کی قسم کھائی ہے۔ لیکن اسے تو مانتا ہوں ناں۔ روز حشر تک مومنوں کو بھڑکاتا رہوں گا۔ میں نے قسم کھائی ہے۔ مگر ان انسانوں کی کہانی سنو۔ میں تو ہوں ہی منکر۔ یہ سالے نہ تو منکری کا اقرار کرتے ہیں اور نہ ہی مانتے ہیں۔"

وہ بات ختم کر کے دربار سے باہر کو چلا۔ چیلوں کے لیے اور شاید ہم سب کے لیے بھی۔ ایک سوال چھوڑ کر۔

